مثنویات

محمد امیر احمد علوی بی اے

قیمت ۱۲/

گزارش

یہ مضمون جناب نیاز فتحپوری کی فرمائش سے سالنامۂ نگار بابت جنوری ۱۹۳۵ء کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس مقالہ کا ایک حصہ مسلم اکاڈمی لکھنؤ کے جلسے میں پڑھا گیا۔ اور مکمل مضمون رسالہ نگار میں شائع ہوا۔ رسالہ پر جو تبصرے مختلف اخبارات و رسائل میں ہوئے ان میں اس گران بہا مقالے کی بہت تعریف کی گئی اور متعدد احباب نے خواہش کی کہ یہ مضمون جداگانہ کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے۔

میری ناچیز استدعا پر جناب مولف مدظلہ العالی نے اس مقالہ کو کتابی شکل میں اشاعت کی اجازت عطا فرمائی اور بعد حذف و اثبات مضمون کی صورت اس قدر تبدیل کردی کہ جن حضرات نے نگار میں ان خیالات کا پہلا خاکہ ملاحظہ کیا ہے وہ اس رسالہ کو شاید ایک جدید تالیف تصور فرمائیں گے۔ اس کتاب میں طرز جدید کے مثنوی نگار شعرا پر تبصرہ قصداً ترک کیا گیا ہے کیونکہ جناب مولف مدظلہ العالی کے نقطہ نظر سے ان مثنویات پر تبصرہ کا ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ نیت تھی کہ یہ کتاب "تذکرہ مثنوی نگاران" کے عنوان سے شائع کی جائے اور سب شعراء مثنوی گو کے مختصر حالات اس میں شامل کردئے جائیں لیکن جناب مولف نے یہ زحمت گوارا نہ فرمائی۔ اگر زندگی باقی ہے تو اس اہم خدمت کی میں خود آئندہ تکمیل کروں گا السعی منی والاتمام من اللہ

میں حضرت قبلہ مدظلہ العالی اور محترمی نیاز صاحب فتحپوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان حضرات نے اس نایاب مضمون کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی راقم الحروف کو اجازت عطا فرمائی

امیر محل لائبریری نصیر باغ کاکوری
لکھنؤ ۳۱ جنوری ۱۹۳۶ء

مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اصطلاح شعراء میں مثنوی اُس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کی ہر بیت کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور سب اشعار ایک ہی بحر میں ہوں۔ نہ قصیدے کی طرح ابیات کی تعداد محدود ہے نہ غزل کی طرح ردیف کی قید ہے۔ جذبات انسانی۔ مناظر قدرت۔ فلسفہ و تصوف حسن و عشق۔ رزم و بزم کی داستانیں اس صنف سخن میں بخوبی نظم ہو سکتی ہیں۔ اور واقعہ نگاری کے لئے اس نوع سے بہتر مشرق کی شاعری میں کوئی اسلوب نہیں ہے۔ سات بحریں اس صنف کے لئے مخصوص ہیں۔

۱۔ مفعول مفاعلن فعولن (ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف)

مثال۔ شبنم کے سوا چُرانے والا اوپر کا تھا کون آنے والا

۲۔ مفتعلن مفتعلن فاعلات (سریع مسدس مطوی موقوف)

مثال۔ ہست کلید در گنج حکیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۳۔ فعولن فعولن فعولن فعول (متقارب مثمن مقصور)

مثال۔ چھپاتے چھپاتے خبر ہو گئی۔

۴۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلات (رمل مسدس مقصور)

مثال۔ بشنو از نے چوں حکایت میکند

۵۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن (خفیف مسدس مقطوع)

مثال۔ السلام اے ائمۂ اطہار

۶۔ مفاعیلن مفاعیلن فعولن (ہزج مسدس محذوف)

مثال۔ نہیں کوئی بُرائی سر سے پا تک

۷۔ فاعلاتن فعلاتن فعلن (رمل مسدس مخبون)

مثال۔ اتنا آنے میں تامل نہ کرو نہ کرو مجھ سے تغافل نہ کرو

اس ہمہ گیر طرز کی ایجاد کا فخر غالباً ایران کو حاصل ہے اور فارسی شاعری کا گران ترین گنجینہ اسی صنف کلام میں محفوظ ہے۔ شاہ نامہ۔ سکندر نامہ۔ حملۂ حیدری بیان رزم میں۔ یوسف زلیخا اور شیریں خسرو۔ داستانِ محبت میں۔ ہفت پیکر و ہشت بہشت قصص و حکایات میں۔ بوستان تعلیم اخلاق میں۔ اور مثنوی معنوی تصوف میں وہ بینظیر نظمیں ہیں جو فارسی شاعری کی حیات جاوید کا باعث ہوئیں اور جن کو ادب ایران سے خارج کر دیا جائے تو ہملٹ کا تماشہ بغیر شہزادہ مظلوم کے یا اندر سبھا کا کھیل بغیر گلفام کے رہجائیگا۔ اردو شاعری فارسی کے سانچے پر ڈھالی گئی۔ علم عروض ایران کی معرفت آیا۔ اصنافِ کلام ایران سے آئے تشبیہات و استعارات بلکہ شاعرانہ خیالات بھی اسی ملک سے لئے گئے۔ بحرین ایران کی تھیں اور اُن کے ابتدائی شناور بھی فارسی نژادوں کے وارث یا شاگرد تھے۔ عُرفی و نظیری۔ صائب و کلیم نے ہندوستان کے سخن فہموں کو غزل کا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اس لئے دکن میں نظم اُردو کی داغ بیل ڈالی گئی تو پہلے غزل ہی تختۂ مشق بنی۔ مگر مثنوی کی لذت سے آشنائی تھی۔ اور اسکی منفعت و عظمت سے شناسائی۔ لہٰذا باوجودیکہ زبان میں ادائے مضامین کی قدرت نہ تھی مگر پہلے ہی دور سے مثنوی لکھنے کی کوشش کی گئی۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل کچھ اور چاہیئے وسعت مری زباں کے لئے

زمانۂ حال کی تحقیقات کے مطابق نظم اردو کا قدیم ترین دیوان سلطان محمد قلی قطب شاہ بادشاہ گولکنڈہ کی تصنیف ہے جو ۹۸۸ھ سے ۱۰۲۰ھ تک سریر آرائے حکومت رہا۔ اس دیوان میں متعدد مثنویاں پھولوں۔ پرندوں اور رسوم و قواعد کے بیان میں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ۱۰۱۸ھ میں ایک مثنوی نعت میں لکھی تھی۔ اور یہی پہلی مثنوی تھی جو دکنی بھاشا میں نظم کی گئی۔ مگر وجدی کی مثنوی تحفۂ عاشقان اس سے بھی پہلے

کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ تحفۂ عاشقان تاریخی نام ہے اور اس سے ۱۰۱۵ھ حاصل ہوتے ہیں۔ اسی عہد قدیم میں سرزمین دکن پر متعدد مثنویاں تصنیف ہوئیں جن میں سے غواصی کی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال ہنوز مشہور ہے اور اس کا سال تصنیف ۱۰۳۵ھ ہے۔

برس ایک ہزار ہور پنج تیس میں　　　کیا ختم یو نظم دن تیس میں

غواصی نے ملا ضیاء الدین بخشی ۷۳۵ھ کے "طوطی نامہ" کا ترجمہ نظم کیا۔ "بزبان قدیم نصفے فارسی و نصفے ہندی بطور ریکٹ کہانی" اور اس کا سال تصنیف ۱۰۴۹ھ تھا۔ کمال خان رستمی بیجاپوری نے ۱۰۵۶ھ میں ایک طویل مثنوی "خاور نامہ" لکھی جس میں جناب امیر علیہ السلام کے فتوحات کا بیان تھا۔ اس میں کہا جاتا ہے کہ اٹھتی ہزار اشعار تھے اور ڈیڑھ برس میں تصنیف ہوئی تھی۔ علی عادل شاہ المتوفی ۱۰۸۳ھ کے عہد سلطنت میں نصرتی نے کئی مثنویاں لکھیں جن میں سے ایک "علی نامہ" عادل بادشاہ کے فتوحات کی داستان شاہنامہ کے جواب میں تھی۔ جو نسبت غریب عادل کو کیخسرو اور افراسیاب سے اور اس کے سپہ سالاروں کو رستم و سہراب سے تھی شاید وہ نسبت بھی اس مثنوی کو شاہنامہ سے ہوگی۔ اس مثنوی کے چند اشعار تذکرۂ گلِ رعنا میں نقل کئے گئے ہیں۔ ان میں سے دو صاف شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

خریدار کو خوب سودے سے کام　　　نہ دکان کا دیکھنا سقف و بام
سخن میں نزاکت کی بُو دیکھ بھول　　　کہ خوش باش سوں قدر پاتا ہے پھول

ابن نشاطی کی مثنوی پھول بن (۱۰۶۶ھ) اور جنیدی کی ماہ پیکر اسی دور کی تصنیفات بتائی جاتی ہیں۔ لیکن اب تلاش سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ پھول بن میں سکندر اور لقمان وغیرہ کے قصے تھے اور اس کی ایک جلد کلکتہ کے سرکاری کتب خانہ میں موجود ہے۔ اسی زمانہ کے قریب دیار مشرق کے ساکنین میں سے ایک بزرگ محمد افضل نام مشہور ہوئے

جن کی بابت قائم چاند پوری نے تذکرۂ مخزن نکات میں لکھا ہے کہ "تصنیفاتش بمرتبہ موثر دلہا است کہ از حیز تحریر و تقریر متجاوز است" انھوں نے ایک مثنوی بکٹ کہانی لکھی جو مدتوں شمالی ہندوستان میں زبان زدِ خلائق رہی۔ اس مثنوی کا ایک شعر تذکرہ گلزار ابراہیم میں درج ہے۔

مسافر سے جنھوں نے دل لگایا　　اُنھوں نے سب جنم روتے گنوایا

افضل الدین خاں فضلی دکنی نے ایک مثنوی پانچسو اشعار کی شہزادۂ دکن کی تعریف میں لکھی جس کا ایک شعر بعض تذکروں میں درج ہے۔

عرق منھ پہ چوں آرسی میں حباب　　تبسم لبان پر جو موجِ شراب

اسی دوران میں ملا ہاشمی نے یوسف زلیخا کا مشہور قصہ نظم کیا اور اس کے بعد خواجہ بحری نے ۱۱۱۲ھ میں ایک مثنوی من لگن نام تصوف میں لکھی۔ انداز بیان یہ ہے:—

چالیس برس یہی تھی مستی　　یو شعر یو شاہدان پرستی

ہندی تو زبان ہے ہماری　　کہتے نہ لگے ہمن کو بھاری

ہر بول میں معرفت کی بانی　　سیتا کی نہ رام کی کہانی

دستورِ عمل ہے عاملاں کو　　دارو ہے دُکھی پڑی ولاں کو

یعنی ہمیں سب صفت ہیں تو ذات　　کیون ذات کی کر سکے صفت بات

مگر ان سب تصنیفات کو اردوئے معلےٰ سے وہی دور کا رشتہ ہے جو حکیم ڈارون کے قول کے مطابق بندر کو انسان سے تھا۔

نظمِ اردو کے مجدد میر شمس الدین ولی نے ۱۱۴۱ھ میں ایک مثنوی شہدائے کربلا کے احوال میں لکھی جس کا نام غالباً دہ مجلس منظوم تھا۔ مکمل نظم اب دستیاب نہیں ہوتی مندرجہ ذیل اشعار اسی مثنوی کے سمجھے جاتے ہیں۔

الہی عشق میں مشتاق کر مجھ — اپس کے شوق کا مشتاق کر مجھ

عیاں کر دل اُپر (اوپر) رازِ طریقت — سینے (سینے) پر کھول ابوابِ حقیقت

مجھے دے نقشِ گُل سوں دلمیں داغان — مرے مقصد کے روشن کر چراغان

یہ دل معمور کر جیوں شیشۂ گُل — پریشانی نہ دے مانندِ سنبل

دے اے ساقی پیا پے جام دو چار — کہ مائل ہوں اسی مے کا میں لاچار —

جو بخشے وہ مجھے اک جوشِ مستی — فراموشی میں بھولے خود پرستی

ولی کے کلیات میں ایک مختصر مثنوی شہر سورت کی تعریف میں بھی ہے۔

عجب شہران میں ہی پر نور یک شہر — بلاشک وہ ہی جگ میں مقصدِ دہر

رہے مشہور اُس کا نام سورت — کہ جاوے جسکے دیکھے سب کدورت

کنارے اُسکے اک دریائے تپتی (تاپتی) — کہ دنیا دیکھنے کو اُس کے پٹتی

وہاں اشنان جب کرتا ہے عالم — صبح ہور (اور) شام جب کرتا ہی عالم

عجب قلعہ ہے وہاں اک با قرینہ — انگوٹھی میں دنیا کے جیوں نگینہ

اِتی (اتی) آتش پرستان کی ہے بستی — سکھے (سیکھے) نمرود وان آتش پرستی

فرنگی اس میں اتے ہیں کلہ پوش — عدد وہاں جن کی گنتی میں ہی بیہوش

بھری ہے سیرت و صورت سیتے سور (سورت) — ہر اک صورت ہے وہاں امول مورت

سبھا اندر کی ہے ہر اک قدم میں — چھپا اندر سبھا کو لے عدم میں

وہ مجلس کے اختتام کی تاریخ ہے۔

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال — تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال

کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول — ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول

شاہ مبارک آبرو اور مولوی سید محمد نے مثنویاں لکھیں جنھوں نے چند روزہ شہرت پائی مگر سید سراج الدین

اورنگ آبادی کی مثنوی بوستان خیال آج دو سو برس کے بعد بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ یہہ نظم سنہ ۱۱۶۰ھ میں کہی گئی اور اسی رعایت سے اس میں ۱۱۶۰ اشعار ہیں۔

زبس اس میں ہے سیر گلشن تمام — رکھا بوستانِ خیال اس کا نام
عدد جبکہ اس نام کے آئے ہاتھ — مطابق ہوئے سال و ابیات ساتھ
یہ دو دن کی تصنیف ہے حسب حال — زباں پر نکل آیا دل کا اُبال

باغ کی سیر کیجئے :—

ہر اک سمت پانی کی نہروں کی سیر — وہ نہروں میں پانی کی لہروں کی سیر
رواں آب کے ہر طرف آبشار — جدہر دیکھئے ہو رہی تھی بہار
طرب بخش تھا ناچنا مور کا — سماں یا تھا ہر مور کے شور کا
ہر اک سرو پر عشق پیچے کی بیل — خوشی کی گلے میں تھی گویا حمیل
جھکی ڈالیاں بید مجنوں کی تھیں — خم زلف لیلیٰ کے افسوں کی تھی
ہر اک حوض پانی سے لبریز تھا — ہر اک قطعۂ باغ گل خیز تھا
سمن، ارغواں نرگس عبہری — گل لالہ و سیوتی جعفری
درخت آم کے سبز اور سایہ دار — نہالاں نوخیز رنگیں بہار
ادہر بلبلوں کی غزل خوانیاں — اُدہر پھول کی شبنم افشانیاں
ہزارا اناروں کے تختوں کی سیر — نئی کو نپلوں کے درختوں کی سیر
نپٹ جھوم آیا تھا ابر بہار — برستی تھی باریک جھم جھم بہار

جنگل کی وحشت اور تاریکی کا سماں۔

وہ صحرائے وحشت فزا لق و دق — کہ اڑتے تھے شیروں کے دل کے ورق
کہوں کیا میں اُس مینھ کے شدت کی بات — کٹاری تھی بوندی کی ہر بوند سات

پھر اُس پر ستم اندھیرے کا حال — نہ تھی شمع واں غیر چشم غزال
وہ تنہائی و وحشت و بیکسی — مجھے اپنے احوال پر تھی ہنسی
صدا رعد کی شدت گرد و باد — قیامت کے دن کی دلاتی تھی یاد
گزرتا تھا ہر آن دل پہ یقین — مگر صدر کا حکم ہے آج ہی
نہ اُس شب میں تھا روشنی کا نشاں — نہ کچھ تھا ستاروں کا وہم و گماں
ہوا جمع یکجا خدا کا غضب — کہ صورت پکڑ نام پایا تھا شب
چراغ اس اندھیرے میں پاوے کہاں — چمکنا ہی برق کا تھا واں
سیہ شب میں بجلی چمکتی تھی یوں — نظر چشم دلبر میں چمکے ہے جیوں
شب مرگ یا جان کی کال تھی — درازی میں ہر ہر گھڑی سال تھی

بے تکلف دوست کا کردار ملاحظہ کیجئے :۔

نپٹ بے حجابی سے ملنے لگے — ہنسی ساتھ جوں پھول کھلنے لگے
کبھی سر کو لادیں مرے منہ کے پاس — کہ پہونچے ہر اک طرح زلفوں کی باس
کبھی میرے زانو پہ زانو رکھیں — کبھی میرے پہلو پہ پہلو رکھیں
دوپٹا مرا اوڑھ کر لیٹ جائیں — کبھی شال اپنی مرے تئیں اڑھائیں
کہوں کیا کہ کیا کیا کئے مجھ سے چھند — کہ دل اُس کا ہووے ہر اک طرح بند

عارف الدین عاجز المتوفی ۱۱۷۰ھ کا قصہ لال و گوہر اُس عہد کی صاف شدہ اردو کا عمدہ نمونہ ہے

الٰہی دے مجھے رنگین بیانی — عطا کر مجھکو یا قوتِ معانی
سخن کے در کا مجھکو جوہری کر — سخن سنجوں کو میرا مشتری کر
سخن کا لال دے میری زباں کو — درِ معنی سے بھر میری بیاں کو

جنگل کا سین :۔

وہاں ہرگز نہ تھا پانی کا آثار | اجل کا کھیت تھا وہ دشتِ خونخوار
وہاں کی ریت ہیرے کی کنی تھی | وہاں کے کانٹے بھالوں کی انی تھی

جب زبان اس منزل سے آگے بڑھی اور مرزا و میر نے غزل کا خیمہ فلک اطلس تک پہونچایا مثنوی نے بھی ترقی پائی۔ مرزا رفیع سودا نے چوبیس مختصر مثنویاں لکھیں۔ لیکن وہ قصیدہ گوئی اور ظرافت نگاری کے بادشاہ تھے۔ مناظر کی مصوری۔ جذبات کی نقاشی میں ناموری نہ حاصل کر سکے۔ اُن کی بعض مثنویاں قیام الدین قائم کے کلیات میں بھی پائی جاتی ہیں اور لطف یہ ہے کہ سودا کے کلیات میں سودا کا اور قائم کے کلیات میں قائم کا تخلص موجود ہے اور یہ فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے کہ کونسی مثنوی سودا کی ہے اور کونسی قائم کی ہے۔ لیکن مثنوی قصۂ عشق پسر شیشہ گر بہ زرگر پسر یقیناً سودا کی ہے۔ اس کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

حکایت ہے کہ اک عابد بآفاق | عبادت کرنے میں تھے حق کی وہ طاق
خدا کی یاد میں رہتے تھے دن رات | نماز و روزہ میں گزرے تھی اوقات
بجز تسبیح رہتے تھے وہ ہیکل | مُصلے پر سے اُٹھتے تھے نہ اک پل
غرض کیا کہئے اُن کی ذاتِ عالی | نہ رہتی تھی کراماتوں سے خالی
جہاں وہ گاڑ دیتے اپنی مسواک | لگے تھے ناشپاتی سیب انگور تاک
ہوئے عازم وہ کعبہ کے سفر کے | کہ ہوں تا معتکف خالق کے در کے
ملے اک روز سودا سے وہ ناگاہ | کہا مجھکو ہے قصدِ کعبتہ اللہ
نجات اپنی اگر تجھکو نظر ہے | تو آمرزش کا موجب یہ سفر ہے
یہ بہتر ہے کہ چل ہمراہ میرے | جرائم عفو واں سب ہونگے تیرے
غرض اسکی کہاں تک کیجئے شرح | کیا ہی ہم سفر سودا کو ہر طرح
نہیں یہ بات خالی از کرامات | لیا ایسے کو ہمرہ کر کے دو بات

پھر اس کے بعد سامانِ سفر کر — کیا دونوں نے ملکر قصد ادھر
سوار اپنے ہوئے مرکب پہ یہ جب — مرید اُنکے ہوئے گرد اُنکے سب
اُٹھا ہر اک کسی عہدے کو ہوئے ساتھ — عصا کوئی کوئی لے مورچھل ہاتھ
کوئی لے پیکداں اور کوئی رومال — کوئی حضرت کے آگے کوئی دنبال
مصلا کوئی سر پر رکھ کے اُس دم — چلا صلوٰۃ پڑھتا شاد و خرم
بوضع خویش اُس مجمع کے اندر — برہنہ پا و سر سودا قلندر
غرض دو چار کیں تھیں منزلیں طے — کہ شیطاں نے کئے قزاق در پے
رہی جب پانچویں منزل کئی کوس — وہ پہونچے کرتے حضرت کا قدمبوس
نصیبوں کا ہیں آگے کیا کہوں پھیر — مریدوں کے سمیت اُس کو لیا گھیر
کیا غارت اُنھیں ایسا ہی اک بار — نہ چھوڑا ایک کی تسبیح کا تار
پیادہ کس طرح یہہ کاٹتے راہ — عصا گر رہ گیا پاس اُنکے سو آہ
نہ زادِ راہ پاس اُنکے نہ مرکب — اب اُن سے عزمِ کعبے کا بندہ ہو کب
کبھو عمامے کے جانے کا مذکور — کبھو تھا فکر پیراہن سے دل چور
سلیمانی کی گہہ یاد آتی تسبیح — ہوئی جاتی تھی جسکے غم سے تشریح
کبھو کہتے مصلا تھا چکن کا — کہ جس پہ تھا چکن کا ر دکن کا
کبھو کہتے کہ یارو کیا عصا تھا — بڑے حضرت کے میری ہاتھ کا تھا
لٹے جب اس طرح اسباب سارا — تو ہوا یسے سفر کا کیونکہ یارا
ارادہ تھا کہ واں جا کر مریں ہم — نہ چاہے گر خدا تو کیا کریں ہم
مرید از بس تھے گھر چلنے کے مائل — کہا سودا سے باہم ہو کے یکدل
سخن حضرت ہمارے کا ہے معقول — یہیں سے حج اُنھوں کا ہوگا مقبول

هوے تھے صبح جس منزل سے راہی　　پھر آئے شام وان ہو کر تباہی

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ تذکرۂ گلشن بیخار میں لکھتے ہیں کہ "مرزا از اقسام شاعری در مثنوی ملکہ معقول نہ داشت" اور یہی سودا کی مثنویوں پر بہترین ریویو ہے۔

البتہ میر تقی نے متعدد مثنویاں درد و تاثیر سے لبریز لکھ کر شعر و سخن کے اس تختہ پر آب حیات کا چھینٹا دیا۔ خصوصاً شعلۂ شوق اور دریائے عشق میں فصاحت و بلاغت کے وہ آبدار موتی پروئے کہ یہ نظمیں عروسِ سخن کا زیور بن گئیں۔ اور آج تک مثنویوں کی صفِ اول میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔ افسانے دلچسپ نہ سہی دردناک ہیں۔ حکایتیں طویل نہیں نتیجہ خیز ہیں۔ جذبات کی مصوری اور مناظر کی نقاشی ہے۔ بیان کی سادگی۔ گفتگو کی شیرینی میر صاحب کا حصہ ہے۔

از مثنوی شعلۂ شوق

"پھیہ سرگرم فریاد و زاری ہوا　　لہو اُس کی آنکھوں سے جاری ہوا
جگر غم میں یکلخت خوں ہو گیا　　رُکا دل کہ آخر جنوں ہو گیا
گئے ہوش و صبر اُس کے یکبارگی　　طبیعت میں آئی اک آوارگی
سراسیمگی سے بگولا ہوا　　پھرے اس طرح جیسے بھولا ہوا
کبھو یاں کبھو واں بحالِ خراب　　وہی بیقراری وہی اضطراب
ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد　　لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد
کچھ اپنے بد و نیک کی سدھ نہیں　　نکل جائے تنہا کہیں کا کہیں
کبھو جا کے صحرا سے لاویں اُسے　　کبھو روتے دریا پہ پاویں اُسے
کبھو خاک ملتا ہے منھ پر کھڑا　　کہیں ہے خرابے میں بے سدھ پڑا"

از مثنوی دریائے عشق (اینجاست کہ آفتاب تیز است)

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال　　ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال

دل میں جاکر کہیں تو درد ہوا | کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہوکے بہا | کہیں سر میں جنوں ہوکے رہا
خار خار دل غریباں ہے | انتظار بلا نصیباں ہے

(آغاز محبت)

ایک دن بیکلی سے گھبرایا | سیر کرنے کو باغ میں آیا
ایک غرفے سے ایک مہ پارہ | تھی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑگئی اُسپہ اک نظر اُس کی | پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی | وہ نظر ہی وداع طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ | صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بے قراری نے کج ادائی کی | تاب و طاقت نے بیوفائی کی
بستر خاک پر گرا وہ زار | درد کا گھر ہوا دل بیمار

(دایہ کے فریب میں پھنسکر دریا میں کودتا ہے)

بے خبر کار عشق کی تہ سے | جست کی اُس نے اپنی جاگہ سے
تھا سفینے میں یا کہ دریا میں | موج زنجیر ہوگئی پا میں
کھینچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب | تھی کشش عشق کی بگرد آب
کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں | ڈوبے ایسے کوئی نکلتے ہیں
ڈوبے جو یاں کہیں وہ جا نکلے | غرق دریائے عشق کیا نکلے
عشق نے آہ کھو دیا اُس کو | آخر آخر ڈبو دیا اُسکو

(عاشق و معشوق کی لاش دریا سے نکلتی ہے۔)

نکلے باہر و لے موے نکلے | دونوں دست و بغل ہوئے نکلے

ربط چسپاں بہم ہویدا تھا — مر گئے پر بھی شوق پیدا تھا
ایک کے ہاتھ ایک کے بالیں — ایک کے لب سے ایک کو تسکیں
جو نظر اُن کو آن کرتے تھے — ایک قالب گمان کرتے تھے

"مثنوی در بیان دنیا" میں ضعف پیری کی لاجواب تصویر ملاحظہ ہو:—

جوانی گئی موسم شیب ہے — شہود ایک دو روز کو غیب ہے
نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام — مزا کچھ نہیں ہو چکی صبح شام
بلا ارتعاش تنِ زار ہے — ہر ایک عضو چلنے کو طیار ہے
نہ پوچھو لب و لہجہ بے طور ہے — سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے
صد افسوس لطف سماعت نہیں — صدا دُور سے جیسے آوے کہیں
شباب آہ داغِ جگر دے گیا — قد خم زمیں کی طرف لے گیا
جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی — سفیدی مُو سے سحر ہو گئی
کھڑے ہوں تو تھرّائے ران اور ساق — جئیں بیٹھے کیونکر کہ جینا ہے شاق
جو یوں پاؤں چلتے بچلتے رہے — تو دیکھو گے ہم پانسے چلتے رہے
اگر ضعف سے چپ ہی رہتے ہیں ہم — یہ سوچو تو کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم
بدن کی ہوئی میرے صورت ہی اور — وے آنکھیں نہیں وے نہ چتون کے طور
لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ — در و بام پر حسرتوں سے نگاہ
شکن جلد میں دل کو پژمردگی — غریزی حرارت میں افسردگی
برودت بہت جسم میں آ گئی — مزاجی تھی گرمی سو ٹھٹھرا گئی
سیہ روئے شیب اک ستم کر گیا — لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا

اسی زمانہ کے قریب خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر نے ایک نظم خواب و خیال تصنیف

کی جس کو بعض تبصرہ نگار اعلیٰ درجہ کی مثنوی خیال کرتے ہیں۔ شاید ایسی ہی ہو۔ نہ کوئی مسلسل قصہ ہے نہ داستان۔ نہ مصوری ہے نہ سیرت نگاری (یہ زیادتی ہے) صرف زبان کی صفائی ہے اور معاملت ہیں عریاں نگاری کی ایجاد کا شرف انہیں کو حاصل ہے شاعر کو خود اعتراف ہے کہ

وضع اُس کی ہوئی خلاف طبع　　ہے مجھے اس سے انحراف طبع

یہ تو قابل نہیں سُنانے کے　　نہیں لائق کہیں دکھانے کے

ایک دو دن میں لکھ کے پھینک دیا　　نہیں معلوم کن نے اس کو لیا

اب جو دیکھو کسو کے پاس کہیں　　ہیں یہ اشعار اُسی کے میری نہیں

مثنوی کا بیشتر حصہ فارسی اشعار اور میر درد کی غزلوں سے بھرا ہوا ہے سیکڑوں اشعار معشوق کے سراپا کی توصیف میں ہیں جنہیں سے چند مرزا علی لطف نے تذکرۂ گلشن ہند میں نقل کرکے اس نظم کی تضحیک کی ہے۔ مثلاً :-

ناک ہے یا کہ ایک طوطا ہے　　چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے

ذائقہ میں تو جیسے یہ لب ہیں　　شہد و شربت جو کچھ کہو سب ہیں

دانت یوں پھر چمکتے ہیں سارے　　رات اندھیری میں جیسے ہوں تارے

میر تقی علیہ الرحمۃ نے بھی ایک مثنوی خواب و خیال نام لکھی تھی اور اُس میں بھی معشوق کا سراپا تھا۔ صرف ایک شعر پر میر اثر کا کل سراپا قربان ہے۔

سراپا میں جس جا نظر کیجئے　　وہیں عمر اپنی بسر کیجئے

اثر کی اس نظم کے بعض اشعار خوب ہیں۔

ہجر میں جی ہے میرے پاس کہاں　　وصل میں گر جیا حواس کہاں

درد کوئی کسی کا کیا جانے　　اُس کا دل جانے یا خدا جانے

رات کاٹے کوئی کہ دن کاٹے　　بات بنتی نہیں ہے بن کاٹے

مرزا رفیع سوداؔ کے شاگرد رشید قیام الدین قائمؔ نے جن کا دعویٰ ہے کہ

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ — اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

متعدد مثنویاں لکھیں جو سوداؔ کے نام سے مشہور ہوئیں اور ان کے کلیات میں موجود ہیں۔ میر حسن تذکرۂ شعرائے اردو میں قائم کی بابت لکھتے ہیں کہ "مثنویہائے بسیار گفتہ دلبسے دُرہائی معانی سفتہ کہ کسے کم گفتہ" مثنوی ہجو سرما جو عام طور پر سوداؔ کی تصنیف سمجھی جاتی ہے وہ قائمؔ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور مندرجۂ ذیل اشعار بطور نمونہ کے اپنے تذکرہ میں درج فرماتے ہیں۔

سردی اَب کی برس ہے اتنی شدید — صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

چرخ کی اطلسی قبا پہ ہمیشں — نہیں یہ کہکشان ہے دانا کیش

ان دنوں چرخ پر نہیں یہ مہر — گود میں کانگڑی لئے ہے سپہر

دن کو کٹتی ہے دھوپ میں اوقات — کالے کمبل میں رات کاٹے رات

مرزا جان جانان مظہر کے شاگرد میاں محمد فقیہ دردمند نے ایک مثنوی ساقی نامہ لکھی جس کی بابت میر حسن اپنے تذکرۂ شعرا میں تحریر فرماتے ہیں کہ "بسیار بانمک گفتہ وگوہر معانی سفتہ" حکیم قدرت اللہ خان قاسم ۱۲۲۱ھ میں لکھتے ہیں کہ یہ مثنوی "خیلے مشہور و برزبان خلق جاری است" نمونہ ملاحظہ ہو۔

ارے ساقی اے جانِ فصل بہار — یہی تھا ہمارا اور تیرا قرار

ستم سے گزر کچھ تو انصاف کر — خدا سے تو ڈر کچھ تو انصاف کر

کہ میں جان بلب ہوں پیالے کی طرح — لگی ہے مجھے آگ لالے کی طرح

نظر تو کر و ٹک چمن کی طرف — شگوفے کو مستی سے آئے ہیں کف

چمن میں بھرا ہے نشہ یاں تلک — کہ نرگس کی جاتی ہے گردن ڈھلک

(در مدح اُستاد) خدیو سخن میرزا جان جان — کہ حکم اُسکا ہے ناطقہ پر رواں

لقب اُس کا ہی ذوالجلال سخن — کہ بندی ہیں اُسکے سب اربابِ فن
کوئی آج اُس کے برابر نہیں — وہ سب کچھ ہی الّا پیمبر نہیں

(در تعریف محمد علی خاں)

پڑی اُس کی قدرت کی ازبسکہ دہوم — لیا ہاتھ قدرت کا صانع نے چوم

حکایت برسبیل تمثال۔

لگن میں پڑا ایک پروانہ رات — یہ کہتا تھا اربابِ مجلس کے ساتھ
کہ اُس بے پر و بال کی عرض ہے — کہ ابلاغ اسکا تمھیں فرض ہے
مرا شمع سے یہ سندیسا کہو — اُسے خوب سمجھا کے اتنا کہو
یہی تھا لکھا میری قسمت کا جان — قیامت تلک ہجر و وصل ایک آن
جو تجھکو مرا خوش یہ آتا ہے حال — تو مجھکو شکایت کی کب ہی مجال
سراپا مرا گرچہ آتش میں ہے — سعادت مری تیری خواہش میں ہی
وہی کر تو جس میں ترا کام ہو — ولیکن نہ اتنا کہ بدنام ہو
یہ کہکر کیا کام اپنا تمام — ہوا زندگانی کا روز اُسکی شام
جو کوئی عشق میں اس ادب سے مرے — خدا تا ابد اُسپہ رحمت کرے

اس دور میں میر محمد حسین کلیم دہلوی نے فصوص الحکم کا نظم میں ترجمہ شروع کیا مگر بعض عوارض سے مجبور ہوکر کتاب ناتمام چھوڑی اور مرزا فدوی شاگرد صابر علی شاہ دہلوی نے نواب ضابطہ خان کے حکم سے یوسف زلیخا کا ترجمہ کرنا چاہا مگر وہ کوشش بھی بارآور نہ ہوئی جعفر علی خاں زکی ولد مرزا مومن بیگ دہلوی نے جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں منصب سہ ہزاری سے سرفراز تھے ایک مثنوی عشق و محبت کی داستان میں لکھی۔ دو شعر بطور نمونہ کے نقل کئے جاتے ہیں۔

الٰہی شوق سے دل کو جلادے — برہ کی آگ تن میں لگا دے

جلا جوں پھلجھڑی مجھ ناتواں کو ۔۔۔ شرر لبریز کر ہر استخواں کو

انھوں نے ایک مثنوی حُقّہ بادشاہ کی فرمائش سے لکھی تھی اُس کے بھی دو شعر سنئے۔

تما کو کو نچا تو کیا سبب ہے ۔۔۔ ملا ہے گڑ سے اور کیونکر طلب ہے

طلب گڑ کی اُسے ہے اِس سبب سے ۔۔۔ ملادے گڑ اُسے پیاری کے لب سے

امروہہ کے میر سعادت علی سعادت نے ایک عشقیہ مثنوی لیلی مجنوں لکھی لیکن اُس کا کوئی شعر تذکروں میں منقول نہیں اور مثنوی نایاب ہے۔

اس عہد کے ایک عاشق مزاج موزوں طبع فضائل علی خان بے قید نے پانچسو بیت کی مثنوی اپنے عشق و محبت کے احوال میں لکھی میر حسن اپنے تذکرے میں فرماتے ہیں کہ "در اوّل خوب است کہ غمزہ دادہائے زنان و بیان حسن آنہا کردہ۔ چون آخر احوال دیوانگی خود آوردہ درحالت دیوانگی پریشان گفتہ" علی ابراہیم خان خلیل تذکرۂ گلزار ابراہیم میں لکھتے ہیں کہ "یہ مثنوی بے نمک ہے" نمونہ ملاحظہ ہو۔

عجب خواب دیکھا ہیں اس خواب میں ۔۔۔ (۱) ہوا جس سے میں پیچ اور تاب میں

ہوا اُٹھا جھنوں سے میں اول جدا ۔۔۔ سو کیا دیکھتا ہوں وہی دلربا

سو کہتی ہے یوں میرا دامن پکڑ ۔۔۔ کہ چھوٹے ترے غم سے میرا جگر

شب و روز رونا مرا کام ہے ۔۔۔ ترا نام لینے سے آرام ہے

پھرے میرے یوسف تو کس کی گلی ۔۔۔ تری چاہ ہیں میں ہوئی باؤلی

یہاں تو جو چاہے تو کر میرے ساتھ ۔۔۔ قیامت کو دامن ترا میرے ہاتھ

جو دیکھا لفافہ پہ لکھا ہے یہ ۔۔۔ (۲) کہ کھولو شتابی برہ کی گرہ

لکھا بعد "یا جامع المفارقین ۔۔۔ سلامت رہو قاتل الشاہدین

تمھاری خوشی سے یہاں خیر ہے ۔۔۔ سدا ہجر کے باغ کی سیر ہے

بہت پھول لالا دکھائے مجھے — ترے داغ سے کچھ نہ بھائے مجھے
کروں کیا نکلتی نہیں جان ہے — کہ یہ میری غلطی کا تاوان ہے
زیادہ نہیں اس سے کچھ مدعا — یہی مدعا تھا لکھا والدعا

شیخ قلندر بخش جرأت نے ایک عشقیہ مثنوی بخشی طوائف کے حالات میں لکھی اور دوسری برسات کی ہجو میں کہی مگر شہرت نصیب نہ ہوئی۔ البتہ ان کے آقائے نامدار نواب محبت خاں فرزند کشتۂ جفائے شجاع الدولہ حافظ رحمت خاں روہیلہ کی مثنوی اسرار محبت عام وخاص میں مقبول ہوئی۔ یہ ۱۱۹۷ھ کی تالیف ہے۔

کہی تاریخ اُس کی یہ بہ صنعت — عجب قصہ ہے اسرار محبت

مصحفی کی زبان ہے اور جرأت کا اندازِ بیان "سسی" اور "پنوں" کے عشق و محبت کا فسانہ ہے یا سوز وگداز کا تصویر خانہ ! پہلے متفرق اشعار سنئے :۔

محبت نام ہے اور ہر دل نگیں ہے — محبت سے کوئی خالی نہیں ہے
کرے بیخود سو وہ مے ہے محبت — خدا جانے کہ کیا شے ہے محبت
یہ گرمی حسن کی اس نازنین پر — کہ گویا مہر اُتر آیا زمین پر
ہر ایک تھا غنچۂ گل جوں گلابی — شجر جھومیں تھے سب مثلِ شرابی
وہ سرگرم رہِ دشتِ فنا تھی — اجل تھی داہنے بائیں قضا تھی

ہجر کی مصیبت :۔

جنونِ عشق جب ہوتا زیادہ — نکل جانے کا کرتی تھی ارادہ
کبھی مکھڑے پہ کر زلفیں پریشاں — گریباں چاک کرتی تا بہ داماں
کبھی پھیلا کے دونوں پاؤں اکبار — زمین پر بیٹھ جاتی ہو کے ناچار
کبھی گھبرا کے اُٹھ کر واں سے چلتی — اُٹھا کر خاک اپنے منہ سے ملتی

غرض دشوار تھا آرام پانا — کبھی اُٹھنا کبھی پھر بیٹھ جانا
کبھی دو دو پہر آوارہ پھرنا — کبھی اُٹھنا کبھی غش کھا کے گرنا
کبھی سر پیٹ لینا گاہ رونا — کبھی بیزار آپ اپنے سے ہونا
کبھی حیران ہو اک سمت تکنا — کبھی بیٹھے کچھ آپ ہی آپ بکنا
اُسے جب کوئی سمجھانے کو آتا — تو یہ روتی کہ بس جی ڈوب جاتا
کبھی چپ اور کبھی رو رو بلکتی — بسانِ موج سر دے دے پٹکتی

مرزا رفیع سودا کے شاگرد حافظ افضل علی ممتاز نے ایک مثنوی لاٹھی نامہ لکھی اور اپنی لاٹھی کا سلسلہ عصائے موسیٰ سے ملا دیا۔ زبان صاف ہے اور طرز بیان دلچسپ۔

ہوتی ہے دنیا میں جو کچھ تحفہ چیز — سب سے ہے ممتاز کو لاٹھی عزیز
کوچ و مقام اسکا ہے سب اپنے ہاتھ — جب کہیں چلئے تو ہو بے عذر ساتھ
ہاتھ میں رکھتے ہیں اُسے ہوش مند — ڈرتے ہیں سب اس سے درند اور گزند
اتنا کم آزار اور ایسا شفیق — اور بھی کوئی ہے کسی کا رفیق
کس میں یہ توفیق ہے کیجو خیال — ہاتھ پکڑ گرتے کو لیوے سنبھال
چوب نہیں دلبر خوش خو ہے وہ — یار ہے وہ قوتِ بازو ہے وہ
اُسکے گھرانے کا جو کیجئے خیال — چھوٹے بڑے جتنے ہیں سب ذی کمال
کوئی تو ہے خامۂ معجز طراز — کوئی ستمگر ہے نئے نغمہ ساز
کوئی تو ہے ہمسر تیغ و قلم — نامِ بزرگان بہ بزرگی علم
اُس کے گھرانے کو بڑائی قدیم — دال ہے اعجازِ عصائے کلیم

گدا علی بیگ بسمل ساکن فیض آباد نے "دینوک نامہ" (دیمک) لکھا جس کے چند اشعار میر حسن نے تذکرۂ شعرائے اُردو میں نقل کئے ہیں۔ زبان قدیم ہے اور شعریت بہت کم۔

جبکہ دیوک کی فوج چلتی ہے — زلزلہ سے زمین دہلتی ہے
در و دیوار گلشن و محفل — ہیںنگے دیوک کی خاک سے کہگل
ہیںنگے اک مہرباں عالی شان — سنئے اب ماجرے کا اُنکے بیان
کہیں دیوک نے یہ کیا ہے خلل — جیسے کچھ اُنکے گھر میں دے کو مھل
دیکھے وس بقچوں کی اگر صورت — تو نظر آئے خاک کی مورت
مشرع محمودی بافتونکے تھان — کترے ہیں اسقدر بہم یکساں
کہئے گر اُن کے نقش کی تمثیل — بنے یک جلد کا غذی قندیل
اُنکے مسند کی کیا کروں تقریر — نقش ہے روئے خاک پر تحریر
چاندنی کو اگرچہ سمجھو آب — پھر جو معلوم ہو تو نکلے سراب
تھا جو غالیچہ مثل گل لالہ — اس سے بہتر ہے مکڑی کا جالا
دیکھ لو تم بھی اتنا کرکے سراغ — مر کے سینوں میں دیوکوں کا داغ
ذرے کے دام میں نہیں خورشید — دیوکوں نے اُسے کیا ہے چھید
آگے اب اس سے کیا کہے بسمل — جیسی دیوک سے اپنے ہے مشکل

کہا جاتا ہے کہ میرحسن نے اپنی بےنظیر مثنوی "سحر البیان" فضائل علی خان بےقید کے طرز پر لکھی۔ بےقید کی مثنوی بلکہ بعض اس سے بہتر نظمیں میر صاحب کے ملاحظہ سے ضرور گزری تھیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایوانِ فصاحت کے بالانشین نے اُن میں سے کسی کو دلیلِ راہ نہیں بنایا وہ خود فرماتے ہیں۔

نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں — نہیں مثنوی ہے یہ سحر البیان
جو منصف سنینگے کہینگے یہی — نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہوگی کبھی

شیخ مصحفیؔ نے "یہ بتخانہ چین ہے بے بدل" اور فخر الدین ماہرؔ نے "ہے اس مثنوی کی یہ نادر طرح" مصرعہائے

تاریخ کہے جن سے مصنف کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ اس طرز کی کوئی دوسری مثنوی اُس وقت اُردو زبان میں موجود نہ تھی۔ بہرحال یہ مثنوی ۱۱۹۹ھ میں بعہد نواب آصف الدولہ بہادر تمام ہوئی اور اُس میں جذبات قلبی۔ واردات عشق۔ ہجر و وصل۔ مناظر قدرت۔ سراپا۔ زیورات رئیسوں کی معاشرت۔ بیاہ شادی کے رسوم۔ اہل حرفہ کی اصطلاحیں۔ آزادونکی بولی ٹھولی کے ساتھ ساتھ قصہ دلچسپ۔ داستانِ پر لطف۔ قافئے چست زبان صاف و شستہ تمام اوصاف و محاسن جمع ہیں اول سے آخر تک کوئی شعر بیکار نہیں اور کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہیں۔

ہجر کی روداد ایسے موثر الفاظ میں بیان کی کہ اردو شاعری کے سارے خزانے میں اس سے زیادہ با اثر اور سچی تصویر غم جدائی کی موجود نہیں ہے۔

خفا زندگانی سے ہونے لگی وہ — بہانے سے جا جا کے سونے لگی
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا — نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے — محبت میں دن رات گھٹنا اُسے
کہا گر کسی نے کہ "بی بی چلو" — تو اُٹھنا اُسے کہکے "ہاں جی چلو"
جو پوچھا کسی نے کہ "کیا حال ہے" — تو کہنا "یہی ہے جو احوال ہے"
کہا گر کسی نے کہ "کچھ کھائیے" — کہا "خیر بہتر ہے منگوائیے"
جو پانی پلانا تو پینا اُسے — غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

بیقراری بڑھتی ہے۔

زباں پر تو باتیں وے دل اداس — پراگندہ حیرت سی ہوش و حواس
نہ مُنھ کی خبر اور نہ تن کی خبر — نہ سر کی خبر نے بدن کی خبر
جو مسی ہے دو دن کی تو ہے وہی — جو کنگھی نہیں ہے تو یونہیں سہی
اگر سر کھُلا ہے تو کچھ غم نہیں — جو کُرتی ہے میلی تو محرم نہیں

ولیکن یہ خوبان کا دیکھا سبھاؤ ۔۔۔ کہ بگڑے سے دونا ہوں ان کا بناؤ

تصویر کشی کے کمالات :۔

عیش بائی مجرے کے لئے حاضر ہوتی ہے۔

وہ خلقت کی گرمی وہ ڈومن پنا ۔۔۔ نشے میں بھبوکا سا چہرہ بنا
وہ بن پونچھے ہونٹوں کی مستی غضب ۔۔۔ کہ مُنھ پر تھی گویا قیامت کی شب
بندھا سر پہ جوڑا پڑی زرد شال ۔۔۔ کمر کی لچک اور ٹمک کی وہ چال
وہ اُٹھی ہوئی چین پشواز کی ۔۔۔ وہ مسکی ہوئی چولی انداز کی
وہ مہندی کا عالم وہ توڑی چھڑی ۔۔۔ وہ پاؤں میں سونے کے دو دو کڑے
چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی ۔۔۔ کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی
وہ آنے لگی کافر اس آن سے ۔۔۔ کہ جانے لگا جی مسلمان سے

ناچ گانا ہوتا ہے

وہ رقص بتاں اور ستھری الاپ ۔۔۔ وہ گوری کی تانیں وہ طبلوں کی تھاپ
وہ دل بینا ہاتھ پر دھر کے ہاتھ ۔۔۔ اُچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ

شہزادہ لب بام سے غائب ہوگیا۔ خواصوں کی پریشانی

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی ۔۔۔ کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو ۔۔۔ گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی ۔۔۔ رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی انگلی کو دانتوں سے داب ۔۔۔ کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب
لب بام کثرت جو یکسر ہوئی ۔۔۔ تلے کی زمیں ساری اوپر ہوئی

وزیر زادی جوگن کا بھیس بنا کر شہزادے کو ڈھونڈھنے نکلتی ہے۔ جوگن کی تصویر۔

کئی سیر موتی جلا راکھ کر — بھبھوت اپنی تن پر ملی سربسر
پہن ایک لہنگا زری باف کا — وہ پردہ ساکر اُس تن صاف کا
زمرد کے مُندرے لگا کان میں — کہ جوں سبزہ گل ہو گلستان میں
زمرد کی سمرن کو ہاتھوں میں ڈال — اور اک بین کاندھے پہ اپنے سنبھال
وہ موتی کا مالا وہ مونگے کا ہار — گل نسترن کی چمن میں بہار
وہ قشقہ کھنچا سُرخ ماتھے پہ یوں — پڑے نور پر لعل کا عکس جوں
پہن سیلی اور گیروا اوڑھ کیس — چلی بن کے صحرا کو جوگن کا بھیس
وہ رخصت جو اس طرح ہونے لگی — تو وہ صاحب خانہ رونے لگی
وہ رو رو کے دو ابر غم یوں ملے — کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے
نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی — نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

آصف الدولہ کے عہد میں نوجوان رئیس زادوں کا فیشن۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن — جوانی کی راتیں مُرادوں کے دن
گلے میں پڑا نیمہ شبنم کا ایک — بدن سے عیاں نور عالم کا ایک
تمامی کی سنجاف جلوہ کناں — کہ جوں عکس مہ زیر آب رواں
طرحدار اک سر پہ پھینٹا سجا — تمامی کا پٹکا کمر سے بندھا
جواہر کا تکمہ گلے میں بندھا — ستارہ ہو جوں صبح کا جگمگا
وہ موتی کا لٹکن زمرد کی ہڑ — لٹک جس کی زیبندہ دستار پر
اک الماس کی ہاتھ انگشتری — سراسر حنا دست و پا میں لگی
اکڑ زلف کی اور کاکل کا بل — جوانی کی شب اور سماں برمحل

کلام کا زور اور قافیوں کی چستی :-

دوپٹے کو کرنا کبھی منھ کے اوٹ | کہ پردے میں ہو جائے دل لوٹ پوٹ
نفیری جو کیجیے تو دنیا کے ساتھ | نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ
غلاف اپنے بانات پر زر کے ٹانک | شتابی سے نقاروں کو سینک سانک
گئی بائیں کی آسماں تک گمک | اُٹھا گنبد چرخ سارا دھمک
کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے | وہ پاؤں کے گھنگرو چھنکتے ہوئے
یہ کہہ نیچے اترا دبے پاؤں وہ | نظر سے بچائے ہوئے چھاؤں وہ
صباحت صفا اُس میں جھلکی ہوئی | پڑی سر سے کاندھے پہ ڈھلکی ہوئی
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل | کہاں کی رباعی کہاں کی غزل
مسافر سے کرتا ہے کوئی بھی پیت | مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت
دیا آسماں پر جو طبلوں کو کھینچ | ہر اک تھاپ میں دل لیا سب کا اینچ

مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں۔ ساری کتاب حفظ کرنے کے قابل ہے :۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم | کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

میر حسن نے دس مثنویاں اور لکھیں چند سحرالبیان سے پہلے اور چند اُس کے بعد مگر اس شاہکار کی چھاؤں تک بھی نہ پہونچ سکے۔

ایسی غزل کہی یہ کہ جھکتا ہے سب کا سر | مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

سید انشا نے دریائے لطافت میں اس مثنوی کے انداز بیان پر تعریض کی "بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی، گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں"۔ لیکن خود اس میدان میں بالکل ناکارہ ثابت ہوئے۔ متعدد مثنویاں "زنبور" و "پشہ" "فیل" و "مرغ" کی داستانیں میں اور ایک اپنے عاشقی کے احوال میں لکھی مگر میر حسن کی گرد کو بھی نہ پہونچے۔ چند اشعار سنئے :۔

کروں کیا جور گردوں کی شکایت | جہاں دیکھو اُسی کی ہے حکایت

ستائے بن تہین ہے کام اسکو / کہاں بن دکھ دئے آرام اسکو
نہیں معلوم منظور اُسکو کیا ہے / بری چتون سے کافر دیکھتا ہے

پہلی ملاقات

گئی آنکھوں تلے بجلی سی اک کوند / سمندِ ناز نے ڈالا اُسے روند
کہا دل نے مرے دیکھی جو وہ مانگ / کہ ہے یہ رات آدھی کچھ دعا مانگ
سہانا تھا کچھ ایسا روپ اُس کا / کہ سایہ چاہتی تھی دھوپ اُس کا
وہ ظالم کے مسی آلودہ دنداں / جھلک میں موتیوں سے بھی دوچنداں
پڑے ہونٹوں میں تھی ایسی دمکتے / کہ ہوں جوں رات کو جگنو چمکتے

فراق کی بیتابی

لبوں پر آہ ہے اور جی میں ہے درد / بھرا کرتا ہوں جب تب میں دم سرد
مجھے کچھ کھانے پینے کا نہیں ہوش / تصور سے اُنھوں کے ہوں ہم آغوش
لگی ہے آگ سی اک دل میں میرے / سمائی وحشت آب و گل میں میرے
یہ گھر سنسان سا اُن بن لگے ہے / کسی کو جس طرح سے جن لگے ہے

اُن کے دوست یکرنگ سعادت یار خان رنگین نے ایک مثنوی ریختی میں لکھی اور عورتوں کی زبان میں میر حسن کے اندازِ بیان کی نقالی کی:—

یہ جو ملتے ہیں اُس سے شرماتی / وہ اُسے چھیڑ چھیڑ گرماتی
آ گئیں خوب اُس کے جب بس میں / پھر تو دینے لگیں اُسے قسمیں
اب تجھ سے ہے یہ سوال میرا / کیوں تجھ کو نہیں خیال میرا
ہستی تری ہے اگر نمودار / تو میری دھڑی بھی ہے دھواں دار
گر نکلے ہے تجھ پہ خلق کا دم / تو مجھ کو بھی چاہتا ہے عالم

افسوس ہو کہ فحش کی آمیزش نے مثنوی کو اس قابل نہ رکھا کہ اس کے طویل اقتباسات پیش کیے جا سکیں اور کوئی مسلسل بیان نقل کیا جا سکے۔

استادالاساتذہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ایک مثنوی بحرالمحبت نام میر تقی کی دریائے عشق کے جواب میں لکھی۔

گرچہ ہے کلک میر نادر کار | تو بھی ندرت کو اپنی کر اظہار
جن مقاموں میں رنگ کم ہی بھرا | دے ذرا اور بھی تو حسن ملا

وہی قصہ ہے وہی بحر لیکن وہ در وہ نہیں۔ میر صاحب کے ہر شعر کا جواب لکھنے کی کوشش فرمائی ہو۔

میر:- ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ | صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
مصحفی:- جان ہونٹوں پہ آئی آہ کے ساتھ | لہو آنے لگا نگاہ کے ساتھ

میر:- نکلے باہر دلے ہوئے نکلے | دونوں دست و بغل ہوی نکلے
مصحفی:- دو ہم آغوش دام میں نکلے | پکے اپنے وہ کام میں نکلے

میر:- کھنچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب | تھی کشش عشق کی نگر تہِ آب
مصحفی:- کفش کے ساتھ ہی گیا تہِ آب | ہوا غواص گوہر نایاب

شیخ صاحب مثنوی کے خاتمہ پر عرض پرداز ہیں:-

ہے توقع کہ صاحب انصاف | مجھکو اس گفتگو میں رکھیں معاف
کچھ مرے حق میں خیر و شر نہ کہیں | نہ کہیں بد بھی نیک گر نہ کہیں

لہٰذا موازنہ مناسب نہیں اور اظہار رائے کی ضرورت نہیں ہنسوڑ کہتے ہیں:-

"کہاں چاندنی چوک کی سلونی زبان اور کہاں یہ امردہہ کا پھیکا پکوان!!"

اس بحر کے آبدار موتیوں کا نمونہ یہ ہے:-

ہجر میں وصل جاودانی ہو | ہجر عاشق کی زندگانی ہے

نہ کوئی آشنا نہ ہمدم ہے — ہے جو مونس تو بس ترا غم ہے
جان مضطر ہو تن سے جانے لگی — بیخودی میں غشی سی آنے لگی

مصحفی کے شاگرد رشید طالب علی خان عیش نے ایک مختصر مثنوی "سوز و ساز" لکھی قصہ دلچسپ نہیں لیکن بندش کی صفائی اور تاثیر کلام میں استاد سے گوئے سبقت لے گئے۔ چند شعر درج کئے جاتے ہیں:۔

سرمایۂ سوز و ساز ہے عشق — نیرنگ نیاز و ناز ہے عشق
دل بسکہ ضعیف و ناتواں ہے — تن پر مرے جان بھی گراں ہے
طاقت نہیں جان مضمحل میں — اک آگ سی لگ رہی ہے دل میں
ناساز ہوئی جو زندگانی — بیمار نے اپنی موت ٹھانی
گر عشق دکھائے اپنی بازی — محمود کیا کرے ایازی

مصحفی کے دوسرے نامور شاگرد میر تقی ہوس نے نظامی کی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ کیا اور ایسی دردناک مثنوی لکھی کہ دریائے عشق اس کے آگے پانی پانی ہے قصہ دلچسپ انداز بیان دردخیز۔ بحر عاشقانہ۔ مثنوی کو قبولیت نصیب ہوئی۔ زبان اب بہت ترقی کر چکی ہے "نپٹ" "نت" "ڈھونڈھنا" وغیرہ الفاظ غیر مانوس ہو گئے ہیں لیکن کلام کی تاثیر آج بھی دلوں میں چٹکیاں لیتی ہے۔ اور آنسوؤں کے دو چار موتی شاگرد مصحفی کی اس یادگار پر چڑھانا ہی پڑتے ہیں۔

ابتدائے عشق:۔

از بہر تجسس دل آرام — جھک جھک کبھی دیکھتا در و بام
کرتا کبھی دیکھنے کی گھاتیں، — کرتا کبھی آپ ہی آپ باتیں
رک رک کے گہے زار زار رونا — اٹھ بیٹھتا گاہ سوتا ہوتا
کرتا کبھی چاک پیرہن کو — ملتا گہے خاک سے بدن کو

ہر کوچے میں بے قرار پھرتا
غش کھا کے ہر ایک در پہ گرتا

لیلیٰ غرفہ سے مجنوں کو دیکھتی ہے :—

آلودہ بگرد وہ سراپا
ڈوبی یہ عرق میں سر سے تا پا
تہہ گرد کی اُس کے تھی بدن پر
تھا بار لباس اُس کے تن پر
عریاں تھا جو بے کلاہ واں سر
افسوس سے ہاتھ یاں جبین پر
واں درد سے تھا وہ دست بر دل
یاں عشق سے تھی شکست بر دل
وہ فرشِ زمین پہ پا بزنجیر
مسند پہ یہاں یہ غم کی تصویر
وہ صورتِ موج بیقراری
یہ غرق یہ بحر شرمساری
بسمل کی طرح سے وہ پھڑکتا
دل سینے میں اُسکا تھا دھڑکتا
وہ آتش عشق سے پھنکے تھا
یاں ضبط سے اُسکا دم رُکے تھا
ملتی تھی ادہر وہ دستِ افسوس
کرتا تھا یہ دور سے قدمبوس

مجنوں کی ماں کا حالِ زار

ماں کا ترے حال ہی دگرگوں
ہے یاد تری ہی اسکو مجنوں
روتی شب و روز رہتی ہے وہ
بیچین ہو کر یہ کہتی ہے وہ
مجنوں کی مجھے خبر نہ آئی
صورت وہ کہیں نظر نہ آئی
جس روز سے تو جدا ہوا ہے
میں کیا کہوں اُس کو کیا ہوا ہے
مطلق نہیں اپنا ہوش اسکو
غم رکھے ہے نت خموش اُسکو
ہے شدتِ غم مدام اُس کو
ہے خواب و خورش حرام اُسکو
کھینچے ہے جگر سے آہ پر آہ
خوں روتی ہے شام اور سحرگاہ
نے گھر کا اُسے خیال تجھ بن
نے غم سے ہے اس میں حال تجھ بن

بے فرش پڑے ہیں سارے دالان　　　سب گھر ہے بغیر تیرے ویراں
ہے نام ترا ہی لیتی پھرتی　　　بالوں سے ہی جھاڑو دیتی پھرتی

لیلیٰ مجنوں کا قصہ اُردو میں مختلف شعرا نے نظم کیا۔ گارسن ڈی ٹاسی فرانسیسی مستشرق کے وقت تک پانچ شعرا کی مثنویاں اس مضمون پر موجود تھیں۔ اُن میں سے میر محمد محسن تجلی (ہمشیر زادہ میر تقی علیہ الرحمۃ) کی مثنوی ہنوز بعض کتب خانوں میں محفوظ ہے اور شاہ محمد عظیم دہلوی کی مثنوی کا نمونہ حکیم قدرت اللہ قاسم کے تذکرے میں درج ہے مگر کلمۂ انصاف یہ ہے کہ ہوس سے بہتر اس پامال قصہ کو کسی نے اُردو میں نظم نہیں کیا اور قبولیت عام کی سند بھی کسی دوسرے حریف کو نصیب نہ ہوئی۔ تجلی کی مثنوی ۱۲۴۲ھ میں چھپی تھی۔ اور اُس کا ایک نسخہ ریاست رامپور کے سرکاری کتب خانہ میں نظر سے گزرا۔ مولوی کریم الدین "طبقات شعراء اردو" میں لکھتے ہیں کہ "تجلی نے ایک مثنوی لیلیٰ مجنوں کی زبان ریختہ میں بطور خود اچھی کہی ہے گرچہ پسند خواص نہیں" اور یہی تبصرہ اس مثنوی پر کافی ہے۔

نواب اعظم الدولہ سرور دہلوی نے سات مثنویاں یوسف زلیخا۔ شیریں فرہاد۔ لیلیٰ مجنوں وغیرہ تصنیف کیں اور وہ "سبع سیارہ" کے نام سے سپہر سخن پر درخشاں ہوئیں مگر اب اُن کا نشان نہیں ملتا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :-

اگر حاصل ہو عمر جاودانی　　　نہیں بن عشق لطفِ زندگانی

" " " " " " " "

اگرچہ عشق میں آفت ہی یکسر　　　نہیں پر شغل کوئی اس سے بہتر

" " " " " " " "

اندوہ میں اُس کے راحتیں ہیں　　　مرغوب اُسکی اذیتیں ہیں
مجھ کو رہے عشق سے سروکار　　　اس نشہ کا دل سے ہوں طلبگار

مہدی علی خان عاشق دہلوی نے حملۂ حیدری۔ یوسف زلیخا۔ لیلیٰ مجنوں۔ خسرو شیریں کا نظم اُردو میں ترجمہ کیا مگر اب اِن جواہر پاروں کا پتہ نہیں۔ اُنکی "یوسف زلیخا" کی بابت آیندہ صفحات میں کچھ لکھا جائیگا۔

شاہ محمد عظیم المعروف بہ شاہ جھولن دہلوی نے متعدد مثنویاں لکھیں۔ اُنھوں نے اپنے صاحبزادے کا نام "نسۃ نوش" رکھا تھا اُس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

نسۃ نوشا تو بیاہ کر بیٹا　　　گورے مکھڑے کی چاہ کر بیٹا

ایک مثنوی مرضِ موت میں لکھی اور ناتمام رہی اُس کی بابت بیٹے کو وصیت کرتے ہیں۔

عظیما نے آدھی کہانی کہی　　　نسۃ نوش کہیو جو باقی رہی

اِس ناتمام مثنوی کے چند اشعار سنئے:۔

لٹکتی تھی بدھی کمر گاہ پاس　　　مہکتی بدن میں تھی پھولوں کی باس

میں کھولے تھی بال پنج بالی تھی میں　　　سج اپنی نرالی نکالی تھی میں

رُمالی تھی سر پہ زری تار کی　　　تجلی برستی تھی دیدار کی

نہ رہتی تھی کاجل بن آنکھ ایک پل　　　نہ بن آرسی دیکھے پڑتی تھی کل

اُنھوں نے ایک مثنوی "لیلیٰ مجنوں" بھی لکھی تھی جو اب نایاب ہے۔ حکیم قدرت اللہ خان قاسم نے ایک شعر اس مثنوی کا اپنے تذکرہ مجموعہ نغز میں نقل کیا ہے۔

عرب زادیاں باغ و بستاں سے　　　سیہ انکھڑیاں ترکستاں سے

میر ضیاء الدین عبرت شاہجہاں پوری نے پدماوت کا مشہور ہندی قصہ نظم کرنا شروع کیا تھا مگر موت نے فرصت نہ دی سید غلام علی مہدی رامپوری المتخلص بہ عشرت نے اس مثنوی کو ۱۲۱۱ھ میں تمام کیا "تصنیف دو شاعر" تاریخ ہے۔ سبب تالیف نثر میں لکھا ہے۔ اُس عہد کی نثر کا نمونہ دیکھئے:۔

"درمیان شہر رامپور کے نام خاص اُس شہر بلند اور بلدۂ ارجمند کا مصطفےٰ آباد ہے۔ بجہت اُلفت

بعضے یاران نکتہ پرداز اور دوستان محرم راز کے وارد تھا۔ بلکہ بیچ سرکار فیض آثار گوہر درج فتوحات محمد عثمان خاں کہ خاندان عالی شان نواب معلےٰ القاب فیض اللہ خاں مرحوم کے سوائے رشتۂ خواہر زادگی کے نسبت فرزندی کی بھی رکھتے تھے سررشتہ روزگار کہ ہر دنیادار کے تئیں جستجو اُس کی ضرور ہے اور ہر ایک باشندہ اس بازار کا لیل و نہار بفکر روزگار تگاپو میں مجبور رہے۔ میر ضیاء الدین عبرت شاہجہاں پوری خوش باش رامپور رکھتے بیچ سلک رفقائے نجو خان مرحوم کے ہمسلک ہو کر ہر وقت خلوت و جلوت میں انیس و جلیس رہتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ"۔ زبان قدیم ہے مگر انداز بیان دلکش اور قصہ دلچسپ شاعری کا رنگ مندرجہ ذیل اقتباس سے نمایاں ہے :۔

یہہ لکھکر دلمیں پھر بیٹھے جو کی غور — کوئی تاریخ اس کی کہئے خوش طور
کہا دل نے اُسے دیکھے جو شاعر — بلاشک جانے تصنیف دو شاعر

میر حسن کی جوگن کے بعد عشرت کی جوگن ملاحظہ ہو۔

ہوا سب شہر میں اُس کا یہ شہرہ — کہ اک جوگن ہو آئی رشک زہرہ
نہیں دیکھی کسی نے ایسی جوگن — سراپا درد اور غم کی بروگن
کبھن جاردہ رشک پریزاد — سوا ہر ہر کے اُسکو کچھ نہیں یاد
دھیان اور گیان میں وہ نازنیں ہے — کوئی دم یاد سے خالی نہیں ہے
جو اُٹھتی بیٹھتی وہ مہ لقا ہے — سہارے کو عصا یادِ خدا ہے
دم اپنے کی ہے سارنگی بناتی — اسی اک تار کو ہر دم بجاتی

میر درد کے شاگرد مرزا جان طپش دہلوی نے مثنوی "بہار دانش" اردو میں لکھی۔ فارسی قصہ کا ترجمہ ہے زبان قدیم ہے۔ سبب تالیف مولف کی زبان سے سنئے :۔

طبیعت کو تھا ایک شب اضطراب — جگر تفتہ تھا اور آنکھیں پُر آب

دل و سینہ بھی متصل تھا تپاں　　الم سے تھی ہر ایک مژہ خونچکاں
اسی بیکلی میں یہ گزرا خیال　　کہ کب تک رہوں یونہیں آشفتہ حال
مناسب ہے بہلاؤں جی کے تئیں　　بہلاؤں اس آشفتگی کے تئیں
کروں عشق موزوں جہاندار کا　　جو طوطے کی ترغیب سے ہوگیا
کہ ہے قصہ یہ فارسی میں بیاں　　بھلا ہے اگر ہو بہ ہندی زباں

تعریف کمپنی بہادر و گورنر صاحب

یونہیں کمپنی کی حکومت رہے　　یونہیں اس کا عہد ریاست رہے
گورنر بہادر معلّٰے جناب　　کہ جس کا ہوا لارڈ[1] منٹو خطاب
زمیں بوس ہوں اسکو گردوں نشاں　　ہوں مغلوب اُس کے روئیں تناں

اسی عہد کے قریب شیخ غلام علی عظیم آبادی المتخلص بہ راسخ نے مثنوی "راز و نیاز" لکھی۔ قصہ دلچسپ نہیں لیکن بندش کی صفائی اور کلام کی پختگی قابل داد ہے۔

کیا کہوں آہ محبت کیا ہے　　کیا کہوں اس میں مصیبت کیا ہے
جی ہو اضعف کی منزل اس سے　　ناتوانی ہے قوی دل اس سے
ہیں عجب اس کے تصرف کے ڈھنگ　　موم سے نرم کئے اُس نے سنگ
روز کڑھنے کا ہے دستور اس میں　　آنکھیں ہو جاتی ہیں ناسور اس میں

اُن کی ایک مثنوی "نور الانظار" تصوف میں ہے اس کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

آفتابِ فلکِ عز و جلال　　قبلۂ زمرۂ اربابِ کمال
افتخارِ عرفائے نامی　　مستِ صہبائے حقیقت جامی
منتہی شعر کے فن کا تھا وہ　　زبدہ صحاب سخن کا تھا وہ

[1] لارڈ منٹو اول مراد ہیں جو بارلو کے بعد اور ہیسٹنگز سے پہلے ہندوستان کے گورنر جنرل رہے۔

مثنویہائے کثیر اُس نے کہی
بیعدیل اور نظیر اُس نے کہی

ایک از انجملہ ہے از بسکہ فصیح
مدرک اُسکا نہو جز ذوق صحیح

واہ ہر شعر ہے پر کار اس کا
نام ہے سبحہ ابرار اُسکا

دیکھا اس مثنوی کو سر تا سر
رہی یک چند مرے پیش نظر

مجھکو بحر اسکی پسند آئی بہت
طبع نازک کو مرے بھائی بہت

مینے تحریک سے رغبت کے کیا
عزم اس بحر میں غواصی کا

یعنی مینے بھی کہی مثنوی ایک
صرف کی اپنی زبان ہیں ایک

ہے یہ موسوم بہ نور الانظار
دید کو اس کی نگہ ہے درکار

یوسف زلیخا کا قصہ اُردو میں مختلف شعرا نے نظم کیا۔ گارسن ڈی ٹاسی فرانسیسی مورخ نے چھ نسخوں کا ذکر کیا ہے ایک امین کا جو سنہ ۱۶ء میں لکھا گیا تھا۔ دوسرا طپش کا جو اُس نے بزمانہ قید قید خانہ میں لکھا تھا۔ تیسرا فدوی لاہوری کا جس پر اُس کے ایک ہمعصر نے بہت نکتہ چینی کی تھی۔ چوتھا مجیب کا۔ پانچواں عاشق (مہدی علی) کا جو عشق نامہ کے نام سے موسوم ہے اور سنہ ۱۸۴۷ء میں بمبئی سے طبع ہوا"۔ لیکن نگار کی یوسف زلیخا کا اُنھوں نے تذکرہ نہیں کیا جو سنہ ۱۲۱۳ھ میں لکھی گئی اور سنہ ۱۲۷۳ھ میں مطبع طبی سے شائع ہوئی۔ نگار تخلص تھا مرزا قطب علی بیگ دہلوی کا حکیم قدرت اللہ خان قاسم لکھتے ہیں کہ وہ "بسیار پر گو" بغایت "شیرین زبان" تھے۔ اشعار آبدار اساتذہ بکثرت یاد تھے لیکن عیب یہ تھا کہ "بیشتر اشعار دیگران بنام خود میخوانند و سخن سازان بے تحاشا مالکانہ بر زبان می رانند"

یوسف زلیخا کے خاتمہ پر لکھتے ہیں۔

بہت خوبی سے دے انجام اسکو
دو ہفتہ میں کیا اتمام اُسکو

ہوا پورا قصہ جبکہ سارا
سن ہجری یہ تھے بارہ سو بارہ

گننے ابیات جو ہیں اُس کے اکبار | ہوئے تب سہ ہزار و بست اشعار
لکھا تھا جو عشق سے اُس کو خامہ | رکھا تب نام اُس کا عشق نامہ
نگار اب تجھکو خاموشی ہے بہتر | بھلا ہے اب یہ قصہ مختصر کر
گئی آنکھوں سے نیند اب نا گہانی | زباں کر بند بس کر یہ کہانی

کارسن ڈی ٹاسی کے تذکرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہدی علی خان عاشق کی یوسف زلیخا کا نام عشق نامہ تھا وہی نام اس مثنوی کا بھی ہے۔ نگار کی بابت معلوم ہے کہ "بیشتر اشعار دیگران بنام خود میخواند" لہٰذا ممکن ہے کہ یہ مثنوی جو نگار کے نام سے مشہور ہے دراصل وہی "عشق نامہ" ہو جو مہدی علی خان عاشق کی تصنیف تھی۔ بہر حال مثنوی خوب ہے اور افسانہ گوئی کے ساتھ ساتھ شاعری کا جوہر بھی نمایاں ہے۔ زلیخا کی ایک بزم کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہوا تیار جب وہ عیش خانہ | نظر آئی عجب جائے شہانہ
کیا فرش اس میں مخمل اور زری کا | بنا آرام گہ گویا پری کا
لگے زربفت کے پردے دروں میں | مشجر کی بچھی مسند گھروں میں
زلیخا نے دیا تب اُس جگہ بھیج | چھپر کھٹ نازنین کا پھول کی سیج

اسی زمانہ میں سید حیدر بخش حیدری مصنف "آرائش محفل" (قصہ حاتم طائی) نے ایک مثنوی "ہفت پیکر" تصنیف کی جس میں نظامی کی "ہفت پیکر" کا قصہ نظم کیا تھا مگر اب اُس مثنوی کا پتہ نہیں۔

سید بلاقی دکنی نے ایک مثنوی "معراج نامہ" ۱۲۱۵ھ میں تصنیف کی مگر اُس کا بھی ہندوستان میں وجود نہیں۔

شاہ تراب علی قلندر کاکوروی نے ایک طویل مثنوی "عاشق و صنم" ۱۲۱۷ھ میں تمام کی "بجا ہے داستان عاشق صنم کی" مصرعۂ تاریخ ہے۔

فرماتے ہیں :۔

کیا ہے میں نے یہ قصہ جو منظوم
اگر نقصان ہو کچھ اس میں معلوم

کریں اصلاح اُسکی بے تکلف
سمجھکر منصفی سے بے توقف

برس دس ایک اس عرصے کے آگے
کیا تھا مثنوی کا قصد میں نے

شروع قصہ سابق جو کیا تھا
کہیں دو اک ورق لکھا پڑا تھا

نہیں ملتی تھی آگے اتنی فرصت
کہ کیجئے اس کہانی کی کتابت

ہوا اِن روزوں وقت اُسکا برابر
یہی جی میں خیال آیا مکرر

فقط اب مثنوی کی فکر کیجئے
تفکر اور سب بھلا دیجئے

ہوا آخر یہ قصہ کا سرانجام
خدا کے فضل سے پہونچا یہ اتمام

حمد

خدا گر عشق کو پیدا نہ کرتا
تو بندہ حسن پہ کاہیکو مرتا

نہ ہوتی گرم معشوقوں کی بازار
نہ ہوتا گر کوئی عاشق خریدار

کسی پر دل کوئی اپنا نہ کھوتا
سر بازار کوئی رسوا نہ ہوتا

آٹھوں کا میلہ لکھنؤ میں

عجب باغ و عجب تالاب تھا وہ
پسند خاطر نواب تھا وہ

برائے سیر اک عالم وہاں تھا
عجب میلے کے دن عالم وہاں تھا

وہاں تھے جمع سارے شہزادے
ہر اک اپنی نئی سج دھج نکالے

زادنی تابہ اعلےٰ سب وہاں تھے
وزیر الملک و امرا سب وہاں تھے

ہزاروں اہل حرفہ اہل بازار
وہاں بیٹھے تھے کر سامان سے تیار

خلائق کا زبس انبوہ تھا واں
کہیں تو اس جگہ تھا حشر برپا

ہر اک اپنی صدائیں بولتے تھے
کوئی کچھ بیچتے تھے کچھ تولتے تھے
کوئی تالاب پر کرتا تھا اشنان
کہ جس کو دیکھ مہ ہوتا تھا حیران
کوئی تھا کافرانہ سج بنائے
جبیں پر صندلی ٹیکا لگائے

(ہجر و فراق)

پڑا بستر پہ وہ بیمار ہو کر
نہایت زیست سے بیزار ہو کر
نہ کرتا تھا کسی سے گفتگو وہ
نہ ہوتا تھا کسی کے روبرو وہ
نہ خواب و خور سے تھا اُسکو سروکار
ہوئی تھی شکل اُسکی جیسے بیمار
تڑپتے ہی گزری صبح و شام
نہ دن کو چین تھی نہ شب کو آرام
کبھی پیراہن اپنا پھاڑتا تھا
کبھی پتھر پہ سر دے مارتا تھا
کبھی کرتا تھا ایسی اشکباری
گویا چشمہ ہو ہے تازہ جاری
کبھی غش ہو کے گر پڑتا زمین پر
کہ بھر جاتی تھی خاکستر جبین پر
کبھی جوں غنچہ ہو جاتا تھا خاموش
کبھی کرتا تھا بلبل کی طرح جوش
نہ آئی باغ میں بھی اُسکو تسکین
زیادہ بلکہ واں ہوتا تھا غمگین
نہ کہنا وہ کسی کا مانتا تھا
نہ اپنا وہ کسی کو جانتا تھا
اُسے چھوڑا تھا سب نے تن بہ تقدیر
نہ بن آئی کسی سے ایک تدبیر

اسی زمانہ میں حکیم قدرت اللہ خاں قاسم دہلوی مولف تذکرۂ مجموعۂ نغز نے مثنوی مولانائے روم کی بحر میں ایک مثنوی ۳۵۰۰ بیت کی قصۂ معراج میں لکھی اور دوسری مثنوی بوستان سعدی کی بحر میں پانچ ہزار دو سو ابیات کی حضرت غوث اعظم کے کرامات میں نظم کی مگر افسوس ہے کہ اِن مثنویوں کا کسی کتب خانہ میں پتہ نہ چلا۔

شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد رشید لالہ موہن چند منشی نے ۱۲۲۵ھ میں تقریباً ۹۰۰

بیت کی ایک طویل مثنوی لکھ کر ادب اُردو کا دامن جمشید و کیخسرو۔ رستم و افراسیاب کی کہانیوں سے بھر دیا سبب تالیف مولف کی زبان سے سنئے :۔

عزیزان معنی شناس ایک روز — کہ تھا مثل نوروز بہجت فروز
ہم محفل آراستے ہنگام شب — مہیا تھے سامانِ عیش و طرب
وہ مجلس تھی رشکِ بہارِ چمن — ہر اک لحظہ تھا ذکرِ شعر و سخن
تواریخ کا بھی جو مذکور تھا — تو واں پر کسی نے بیان یوں کیا
کہ ہے شاہنامہ تماشہ کتاب — عجب نظم دلکش ہی باآب و تاب
توکل کہ مردِ سخن سنج تھا — کیا ترجمہ اُس نے شہنامے کا
لکھا نثر میں قصۂ مختصر — کہ احوال معلوم ہو سربسر
بہ شمشیر خانی وہ موسوم ہے — تمام اُس میں احوال مرقوم ہے
یہ سنکر برادر مرے مہرباں — سخن فہم دانشور و نکتہ داں
یہ بولے کہ منشی جی اس نامہ کو — تم اب ریختے کی زباں میں لکھو
ہوا میں دل و جاں سے مصروفِ کار — لکھی نظم یہ دلکش و آبدار
مرتب یہ شہنامہ جب ہو چکا — کیا فکر تب سال تاریخ کا
تو پھر ہاتفِ غیب نے صبح دم — کہا قصۂ خسروانِ عجم

مجموعہ نغز سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی کی لال قلعہ میں آمد و رفت تھی اور یہ طویل مثنوی اُنھوں نے بادشاہ اکبر ثانی کے حکم سے لکھی تھی۔

شعرا کے نقطۂ نگاہ سے اس مثنوی میں بیشمار نقائص تھے۔ بندشیں کمزور۔ قافیے سُست۔ محاورے بے محل۔ الفاظ غلط۔ اُن کی بزم میں یہ نظم مقبول نہ ہوئی مگر داستانیں دلچسپ تہیں۔ بیان صاف و سادہ تھا۔ ملک نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور منیزہ کی کہانی گلی گلی

بیان ہونے لگی۔ "منیژہ منم دخت افراسیاب ۔ برہنہ تنم را ندیدہ آفتاب" (شاہنامہ)

منیزہ ہوں میں دخت افراسیاب
کیا گردش آسماں نے خراب

ناگ پنچمی اور سلونو کے میلوں میں یہ شعر اب بھی سننے میں آجاتا ہے۔

پکڑ کر کمربند سہراب کا
زمین سے لیا پیلتن نے اُٹھا

شیخ قلندر بخش جرات کے شاگرد شاہ حسین حقیقت نے ایک طویل مثنوی لکھی۔

نامۂ نامی جب ہوا یہ طے
سن تھے پچیس اور بارہ سے

ختم جس روز مثنوی یہ ہوئی
گیارہویں تھی ربیع الاول کی

شعر اتنے ہوئے کیا جو شمار
سات سو پینسٹھ اور چار ہزار

زبان صاف ہے اور حکایات نہایت دلچسپ۔

نخلبند اُس چمن کا جب میں ہوا
ہشت گلزار نام اُس کا رکھا

گو کہ ہے خوب یا کہ ہو یہ زشت
لیک قصہ یہ ہی بہ ہشت بہشت

خسرو شاعران نے جسکو کہا
فارسی کی زبان میں سرتا پا

ترجمہ اُس کا میں نہیں کرتا
پر وہ قصہ کروں ہوں نظم جدا

شاعری کا درجہ مصنف خود بیان کرتے ہیں۔

کچھ نہیں شاعری کو دخل دیا
قصہ موزون فقط ہی مینے کیا

ربط معنی نہ چستی الفاظ
ہے شکستہ درستی الفاظ

اس طرح سے بعرصہ سہ ماہ
مثنوی مینے یہ لکھی ہے آہ

کیجئے ساعات کا حساب اگر
نظم جن میں ہوی ہیں یہ گوہر

بیس دن سے فزوں نہیں ہوتی
بلکہ کم اس سے ہیں کہیں ہوتے

مثنوی اُستاد کی اصلاح سے محروم رہی۔

عرف میں نام تھا قلندر بخش	دُر معنی سے تھا وہ گوہر بخش
نہ رہا اِس جہان میں وہ مرحوم	آسمانِ ہنر جہانِ علوم
دیکھے اصلاح تا وہ سرتا پا	رہنے دیتا نہ اُس میں سقم ذرا
گرچہ پُر سقم سے رہا یہ کلام	پر ہوں مجبور اس میں ہیں ناکام

باوجود خامیوں کے ہشت گلزار عمدہ مثنویوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اور ہندوستان میں مدت تک اُسکی قدر و قیمت رہی اب کمیاب ہے۔

نمونہ ملاحظہ ہو:۔

یوں سُنا ہے کہ در زمانِ کہن | بادشہ ایک تھا بملکِ یمن
ذات سے اُسکی خلق کو تھا چین | تھا رشید اُسکا ایک نور العین
ہوشمند و شجاع و باتدبیر | نوجوان سن میں اور بہ دانش پیر
صاحبِ عزت و حیا و وقار | رحمدل۔ بردبار۔ نیک شعار
چرخ بدرام۔ رام تھا اُسکا | نام نامی بھی رام تھا اُسکا
سولہ یا سترہ برس کا سن | غرض اُٹھتی جوانی کے تھے دن
تھا ابھی طفل وہ جوان دولت | کر گئی تھی جو اس کی ماں رحلت

اسی عہد کے قریب حکیم مومن خان دہلوی نے متعدد مثنویاں لکھیں جن میں سے شکایت ستم (۱۲۳۱ھ) قصۂ غم (۱۲۳۵ھ) اور قول غمین (۱۲۳۶ھ) نہایت درد انگیز ہیں۔ مگر ادب اردو کی بدنصیبی سے اُن کی واقعہ نگاری اور سخن طرازی کی کچھ قدر نہ ہوئی۔ غزلیں غالب کی "واہ واہ" سے اور مثنویاں میر کی "آہ" سے کم رتبہ سمجھی گئیں۔ اسباب و علل پر مباحثہ فقیر کا شعار نہیں لیکن یہ واقعہ کا اظہار ہے کہ آج سخن سنجوں کی بزم میں چند ہی نفوس اس حقیقت سے آشنا ہونگے کہ مومن کی مثنویاں درد تاثیر میں میر و مصحفی کی مسلسل نظموں سے فائق ہیں اور غالب تو

اس میدان کے مرد ہی نہ تھے وہ صرف غزلوں کی شاخ[1] سے "چوگان" کھیلتے تھے اور اس بازی میں بھی مومن سے اکثر ہارتے تھے!!

مومن اسی نے مجھ سو دی برتری کسی کو | جو پست فہم تیرے اشعار تک پہونچا

(از قول غمین) جدائی

اُسکے کوچے سے نہ اُٹھتا تھا قدم | بیٹھے جاتے تھے ہر اک گام پہ ہم
دل میں جب ہوک اُٹھی بیٹھ گیا | پاؤں اُٹھا بھی تو جی بیٹھ گیا

(آخری ملاقات)

کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی | کہ نہ کچھ بولے نہ کچھ بات ہوئی
ملکے حیرت زدگانِ بیکس | دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس
خونفشان لب پہ وہ آہیں باہم | حسرت آلودہ نگاہیں باہم
گرچہ ہرگز بھی نہ تھی تابِ کلام | پر یہ بولی کہ ذرا جی کو تھام
اب تم اوروں سے لگا لیجو جی | نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی
ہاں اگر فکر ہو تو ہم کو ہو | رنج و اندوہ ہو جو ہمکو ہو
کہ بُری آہ ہماری خو ہے | ہم میں اک مہر و وفا کی بو ہے
تم رہو خوش کسی جاناں کے ساتھ | ہم چلے حسرت ہجراں کے ساتھ
کام دل رنج و بلا کو سونپا | تم کو لو ہم نے خدا کو سونپا

(از قصۂ غم) چھیڑ چھاڑ

وہ ہاتھ کو دم بدم جھٹکنا | وہ تکیئے پہ سر کو دے پٹکنا

---

[1] ایک مختصر مثنوی انبہ کی تعریف میں غالب نے کہی تھی۔

آم کا کون مرد میدان ہے | ثمر و شاخ گوے و چوگان ہے

وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا — وہ ہو کے پتنگ کاٹ کھانا

جائے — ہر جائی کی چٹکیاں وہ لینی — آزردہ ہو گالیاں وہ دینی

پتنگ — وہ جی سے پتنگ ہونے لگنا — کچھ بس نہ چلا تو رونے لگنا

اسی زمانہ میں بھگونت سہائے راحت کاکوروی نے نلدمن فیضی کا خلاصہ اُردو میں نظم کیا۔ قصہ کی ندرت سے مثنوی مشہور ہوئی اور آج تک نوجوانوں کی صحبت میں اُس کی قدر باقی ہے۔ زبان صاف اور شاہنامہ منشی سے بہتر ہے۔ سبب تالیف کتاب:—

قلم سے کرکے اول درفشانی — لکھوں میں دل کے اسرارِ نہانی

کہ تھا از بس سخن سے ذوق مجھکو — سدا تھا مثنوی سے شوق مجھکو

جو دیکھا آج کل ہندی کا چرچا — ہوا دل ایک دن مشتاق اُسکا

کہ عشق نل جو ہے عالم میں مشہور — کرے ہندی زباں میں اسکو مذکور

اگرچہ فارسی میں سب بیاں ہے — مگر طول اُسکی ہر اک داستاں ہے

کرے تو مختصر ایسا بیاں سب — کھلے ہر اک پہ جو رازِ نہاں سب

(ہندوستان کی تعریف)

زبس ہے حُسن میں وہ ملک نامی — بجا ہے گر کرے کنعاں غلامی

وہ کافر زلف رکھتے ہیں کمر تک — پھنسے جسمیں دل اسلام بیشک

جہاں ایسے بتوں کی ہو خدائی — کریں کیونکر نہ واں سب جبہ سائی

یہ مثنوی ۱۲۴۴ھ میں تمام ہوئی۔ "یہ داستان ہے راحت افزا" تاریخ اختتام ہے اُنھوں نے ایک مثنوی "بہارستان کلام عرف قصہ زہرہ وبہرام" ۱۲۴۷ھ میں لکھی تھی اور "ہے یہ باغ وبہار" اُس کی تاریخ اتمام تھی مگر وہ مقبول نہ ہو سکی اور اب کمیاب ہے۔ اس مثنوی کے خاتمہ پر اُنھوں نے اپنا نام بھی[۱] نظم کردیا تھا کہ "بھگونت رائے راحت کاکوروی"

---

[۱] نلدمن میں راحت نے اپنا نام نہیں لکھا۔ تخلص پر اکتفا کی تھی۔ کارپردازان مطبع مجیدی کان پور نے ۱۳۴۳ھ کے ایڈیشن

مگر اُس کو راحت سبھی خاص و عام　　تخلص میں مشہور کرتے ہیں نام

اسی زمانہ میں سید عبد الواحد خان خیر آبادی المتخلص بہ مسکین شاگرد مومن دہلوی نے مثنوی "چشمۂ شیریں" تصنیف کی "آرام باغ" تاریخی نام ہے ۱۲۴۵ھ میں تمام ہوئی :-

اس کی تصنیف کی ہے یہ توصیف　　سترہ دن میں یہ ہوئی تصنیف

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ایک شب تھی جو چاندنی کی بہار　　سیر دریا کو میں اُٹھا اک بار

پھٹ گیا ابر تھمگیا تھا سحاب　　صاف تھا مطلعِ شبِ مہتاب

چند اشخاص واں تھے جلوہ کناں　　شعر خوان نکتہ فہم معنی داں

دیکھ کر مجھکو سب ہوئے بشاش　　بولے خوش آمدی برادر باش

مولوی ابو الحسن حسن کاندھلوی نے ایک طویل مثنوی گلزار ابراہیم نام تصنیف کی۔

جب ہوا اس مثنوی کا اختتام　　تھے سنین ہجرت خیر الانام

ای برادر بالیقین بے ریب و شک　　یک ہزار و دو صد و پنجاہ و یک

پانچویں تاریخ تھی شوال کی　　ختم جمعہ کو ہوئی یہ مثنوی

فرماتے ہیں۔

گو کہ میں بدکار و نافرجام ہوں　　شیرِ یزداں کا ولے ہمنام ہوں

جنبۂ پیغمبر امامِ بو الحسن　　حیدرِ صفدر امامِ بو الحسن

کرکے تو اُس نامِ نامی پر خیال　　بخش اس عاصی کو بھی ای ذو الجلال

ابراہیم ادہم بلخی کا قصہ نظم کیا ہے اور اپنے ہموطنوں کو اسرارِ تصوف سے آگاہ کرنے کی سعی کی ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰) میں بے تکلف لکھدیا کہ "یہ مثنوی تاج بہادر تاج ساکن نوبستہ لکھنؤ کی تصنیف ہو" غنیمت ہو کہ مولوی عبد الغفور نساخ نے تذکرۂ سخن شعرا میں تصریح کردی تھی کہ یہ مثنوی بھگونت سہائے راحت کی ہو۔ ورنہ آج شک ہوتا کہ یہ کتاب راحت کی تصنیف ہو یا تاج کی اور لکھنا پڑتا کہ داستان زندہ ہو مگر داستان گو گمنام ہوگیا۔

مشائخ کے طبقے میں مثنوی مقبول ہوئی اور دیہاتی مکتبوں میں کچھ عرصہ تک اُس کا درس ہوتا رہا۔ مگر شاعروں کی بارگاہ میں نظم کی کچھ قدر نہ ہوئی۔

نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہے یہ دنیا سخت جائے نابکار — ایک حالت پر نہیں اسکو قرار
ہے تغیر اور تبادل دم بدم — اُسکی بوقلمونیاں ہیں پیہم
شام کو کوکب اگر تابندہ ہو — صبح کے ہوتے ہی وہ شرمندہ ہو
شمع کے سر پر اگر ہے تاجِ زر — بادِ صرصر سے ہو لرزاں ای پسر
خلعتِ شاہانہ رکھتا ہو جو تن — چار دن کے بعد ہوتا ہو کفن
بر میں جسکے ہو عروسانہ لباس — ہو وہ اُسکو دوش پر اسباب یاس
ایک بھی خندہ نہیں ایسا یہاں — ہو نہ گریہ ساتھ جسکے توأماں

مصحفی کے مشہور شاگرد شیخ عبدالرؤف شعور نے ایک مختصر مثنوی لکھی۔

سالِ تاریخ کی مجھے تھی فکر — یہ کہا۔ خوب مثنوی کہدی
۱۲۵۳ھ

داستان کچھ نہیں۔ شعریت قربان ہو۔

(شب ہجر)

تھی شبِ ہجر دن قیامت کا — سامنا تھا نئی مصیبت کا
ایک جانب چراغ جلتا تھا — اک طرف دلکا داغ جلتا تھا
سر پہ کھینچے تھی کہکشاں شمشیر — مارتے تھے شہاب ثاقب تیر
کیا قیامت تھی وہ سیاہیٔ شب — چشم آہو بنا تھا ہر کوکب
خواب سے تھیں نہ آشنا آنکھیں — بند ہوتی نہ تھیں ذرا آنکھیں
نہ لگی رات بھر پلک سے پلک — سر پٹکتا رہا وہ صبح تلک

کھینچکر آہ سرد خستہ جگر
یوں لگا کہنے اُے نسیمِ سحر

قاصدِ عاشقانِ زار ہے تو
مرہمِ داغِ دلفگار ہے تو

اس طرح عرض کر کہ ای گلرو
جانِ عاشق فدائے ہر سرِ مو

کوئی دلدادہ تجھپہ مرتا ہے
حال اپنا تباہ کرتا ہے

بسترِ گل پہ تو کرے آرام
مضطرب کوئی مثل ماہیِ دام

وائے غفلت خبر نہیں تجھکو
عشق کا کچھ اثر نہیں تجھکو

دل میں جو اُسکے آیا بکتا تھا
کبھی بالیں سے سر ٹپکتا تھا

(عاشق و معشوق کی نعشین دریا سے نکلتی ہیں)

نکلے دریا سے وہ وسے بیدم
جیسے پیدا ہوں کودکِ توام

کفِ عاشق میں مہرۂ دلبر
دستِ معشوق مشتِ عاشق پر

دونوں ہرگز جدا نہ ہوتے تھے
ہاتھ سے ہاتھ وا نہ ہوتے تھے

ایک صاحب کو دور کی سوجھی
یہ دوا اس فتور کی سوجھی

ساعدِ نازنین پہ رکھ کے چھری
گوش عاشق میں لب پہ بات کہی

دستِ معشوق ہو قلم ہیہات
رکھے عاشق روا ستم ہیہات

فرطِ غیرت سے ہاتھ چھوٹ گیا
ہائے افسوس ساتھ چھوٹ گیا

اسکو کہتے ہیں عشق و مہر و وفا
مر کے بھی پاس چشم زخم رہا

قبولیت عام نصیب نہ ہوئی اور مثنوی نایاب ہو گئی۔

راحت کاکوروی کی مثنوی نلدمن کا اِن اوراق میں تذکرہ ہو چکا ہے۔ یہی قصہ نگہت دہلوی نے بھی نظم کیا تھا۔ ریاست رامپور کے سرکاری کتب خانہ میں ایک نسخہ اس مثنوی کا نظر سے گزرا نواب احمد علی خان والی رامپور کے عہد کی تصنیف ہے۔ کیونکہ آغاز داستان سے پہلے چند اشعار اُن کی تعریف میں ہیں۔ نواب احمد علی خان کا سنہ وفات ۱۲۵۶ھ ہے" خادم

اہلبیت احمد علی" تاریخ وفات لوحِ مزار پر کندہ ہے اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ۱۲۵۶ھ سے پہلے کی تصنیف ہے۔ شاعر کا نام درج نہیں۔ مگر غالباً مرزا امتیاز علی بیگ المتخلص بہ نگہت شاگرد نصیر دہلوی کی فکر بلند کا نتیجہ ہے۔ زبان صاف نہیں مگر شعریت موجود ہے۔

(نل کا خط دمن کے نام)

اے محرمِ راز واقف کار — وے مونس و ہمدمِ دلِ زار

اے جانِ جہاں یارِ جانی — بخشندۂ صد غم نشانی

حُسن تو ہمیشہ در فزوں باد — رویت ہمہ سال لالہ گوں باد

یاں ہجر سے تنگ حال ہیگا — تیرا نہ اُدھر خیال ہیگا

ناسور جگر میں چشم ہے تر — سینے پہ ہے آہ نالہ لب پر

واں تجھکو بناؤ سے سروکار — یاں بگڑی ہے ہمدمِ دلِ زار

آفت یہاں سر پہ سو لگی ہے — جوں شمع تری ہی لو لگی ہے

تونے کیا بد قماش پردہ — یاں ہو گیا اپنا فاش پردہ

میر تقی۔ میر حسن۔ انشا۔ و مصحفی نے لکھنؤ کی مبارک سرزمین پر اپنی مشہور مثنویاں تمام کیں لیکن اُن کے سینوں میں دلی کے "اجڑے ہوئے دیار" کی یاد تھی وہ اپنی زبان و محاورات کی سند کے لئے "خانم کی بازار" اور "جامع مسجد کی سیڑھیوں" کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ لکھنو کی زبان اور بیان کا اسوقت تک کوئی جداگانہ انداز نہ تھا اس لئے زبان کے اعتبار سے ان بزرگوں کی مثنویاں خواہ لکھنؤ کی خیال کی جائیں یا دلی کی مگر ان سب میں عموماً اور سحر البیان میں خصوصاً لکھنؤ کی معاشرت کا اس قدر گہرا نقش ہے کہ کم از کم مثنوی میر حسن کو تو خالص لکھنؤ کی پیداوار سمجھنا چاہیے۔ ناسخ و آتش کے دور میں لکھنؤ نے علم بغاوت بلند کیا

نواب وزیر شطرنج کے بادشاہ بنے۔ متروکات سخن کے نئے دفتر اور معائب کلام کے جدید قوانین مرتب ہوئے۔ تازہ محاورات خانہ ساز ٹکسال میں ڈھلنے لگے شعراتے دلی کی مرکزی حکومت کا جوا گردنوں سے اُتار پھینکا۔ صحت زبان، صفائی بیان پر مرجح قرار پائی صنعت طرازی اظہار جذبات سے اعلیٰ متصور ہوئی۔ اور زباندانی۔ خوش بیانی کا ایک جدید اسکول یہاں قائم کیا گیا اس دور انقلاب کی پہلی مشہور مثنوی شیخ ناسخ کی نظم سراج ہے جو ۱۲۵۴ھ میں مکمل ہوئی۔ چھ سات سو بیتوں میں بعض احادیث کا ترجمہ ہے۔ صحت الفاظ میں شک کی گنجائش نہیں۔ لیکن قافیے بیحد سست ہیں۔ "نیکنام"۔ "نیکخو"۔ "خوش بیان"۔ "خوش کلام" وغیرہ وقت عام صفتیں مصرعوں کا وزن پورا کرنے کو بے ضرورت استعمال کی گئی ہیں اور ایک شعر بھی اس قابل نہیں ہے کہ اس مضمون میں نقل کیا جائے۔

"معجزۂ آلِ نبی" اور "قصۂ شاہ روم" جو اسی زمانہ کی بعض غیر مشہور شاعروں کی تصنیفات ہیں مجدد زبان کی اس مثنوی سے افضل ہیں۔ ان میں روانی اور تاثیر ہے جس کا نظم سراج میں نشان نہیں۔ ناسخ کی مثنوی کلیات میں بحفاظت مقفل ہے لیکن "قصۂ شاہ روم" اب بھی بچوں کی زبان پر ہے۔

عجب تھا سہمگین میدان وہاں کا　　شجر ہی واں نہ تھا سایہ کہاں کا
ہوئی مرضی جو رب العالمین کی　　طنابیں کھنچ گئیں اُس سرزمین کی
وہ شہ اور فوج و لشکر اُسکے ہمراہ　　ستاروں کے ہو جیسے بیچ میں ماہ

نظم سراج سے دو تین سال پہلے ناسخ نے ایک مثنوی اور لکھی تھی جس میں جناب امیر علیہ السلام کے تولد کا بیان اور بعض احادیث کا ترجمہ تھا۔ اُس میں بھی بندش کی پختگی اور ترکیبوں کی دل آویزی موجود ہے مگر شعریت کا پتہ نہیں اور عربی الفاظ بے ضرورت استعمال کیئے ہیں ملاحظہ ہو۔

خدا کا ہی حاضر کلام مبین ہے　　کہ ہے اسمیں کونو مع الصادقین

ائمہ سے وارد ہوا یہ کلام | کہ ہیں صادقین آل خیرالانام
علی ولی ان کا سردار ہے | علوم خدا سے خبردار ہے
بیان الذی جاء بالصدق کا | مفسر رقم کرتے ہیں جا بجا
دُرِّ رجو سیوطی کی تفسیر ہے | یہ مضمون صاف اُس میں تحریر ہو
کہ مقصود اُس سے ہے شبیر خدا | وہی ہے بڑا صاحب اتقا
بروئے کلام جہان آفریں | ہوا مرتضےٰ صالح المومنین
محبو سنو اور ہو دل میں شاد | کہ ہوتا ہے اس آیتہ سے مستفاد
فقط ہیں مددگار و یار نبی | خدا اور روح الامیں اور علی
کہے جبکہ خیر البشر یہ خدا | نہ کیوں سب سے بہتر ہو پھر مرتضےٰ

شیخ ناسخ کے انتساب سے نظم سراج لکھنؤ اسکول کی پہلی مثنوی تصور کی گئی ورنہ شاعرانہ حیثیت سے اس کا کوئی درجہ نہیں۔ علاوہ اُس کے وہ اس جہت سے بھی اول کہلانے کی مستحق نہیں کہ جو اس نظم کا سنہ تالیف ہے وہی سال اُس بے مثال مثنوی کے اختتام کا ہے جس کا ادب اردو میں کوئی ثانی نہ ہو سکا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے گل بکاؤلی کا دلچسپ قصہ جو پہلے سے اُردو نثر میں موجود تھا نظم کیا۔

وہ نثر ہے داد نظم دوں میں | اِس مے کو دوآتشہ کروں میں

اور ۱۲۵۴ھ میں یہ بیش بہا مثنوی تمام ہوئی۔

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد | گلزار نسیم نام بنہاد
بشنید د نوید ہاتفے داد | توقیع قبول روزیش باد

میر حسن نے مناظر کی مصوری اور جذبات کی نقاشی میں کمال دکھایا تھا لیکن داستان اُن کی طبعزاد تھی جس جگہ جیسی ضرورت ہوئی قصہ کو توڑ مروڑ لیا۔

نسیم دوسرے کی لکھی ہوئی "روداد زمان پاستانی" کے پابند تھے اور اس میں ترمیم و تحریف کی گنجائش نہ تھی۔

میر حسن نے زبان صاف۔ سادہ اور بے تکلف اختیار کی جو واقعہ نگاری کے لئے مناسب و موزوں تھی۔ نسیم نازک خیالی۔ نقش طرازی۔ اور معنی آفرینی کے بغیر شعر کہنا وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے اور یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ کسی جگہ اسلوب بیان سحر البیان سے ٹکر نہ کھائے۔ ان سخت قیود کے ساتھ داستان نگاری میں کامیابی نسیم کا سحر و نیرنگ ہے

خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر — نیرنگ نسیم باغِ کشمیر
نقطے ہوں سپند خوش بیانی — جدول ہو حصار سحر خوانی
جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے — مرکز پہ کشش مری پہونچ جائے

مصوری کے کمالات دیکھئے:۔

اک شب راجہ تھا محفل آرا ۱ یاد آئی بکاؤلی دل آرا
پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے — شہزادی بکاؤلی کدھر ہے
منھ پھیر کے ایک مسکرائی — آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہ گئی ایک — ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

راقم الحروف کئی دن غور کرتا رہا کہ مندرجۂ بالا دو شعروں کا جواب اردو شاعری کے تمام سرمایہ میں کہیں موجود ہے یا نہیں بلکہ فارسی کی گرانقدر مثنویوں میں بھی یہ سینما کی سی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں یا نہیں مگر کوئی نظیر یاد نہ آئی۔ ممکن ہے کہ اُس کی کوتاہ نظری کا قصور ہو یا فہم کا فتور۔

جب خوب وہ شعلہ رو نہائیں ۲ باہر بصد آب و تاب آئیں
پوشاک دھری کہیں نہ پائی — جانا کہ حریف نے اڑائی

جھک جھک کے بدن چراتی آئیں
رک رک کے قدم بڑھاتی آئیں
جھنجھلا کے کہا کہ لاؤ مانو
ہم کو بھی بکاؤلی نہ جانو

واقعہ نگاری کی شان دیکھیے:۔

روح افزا نے کہا بہن سے
بہتر کوئی جا نہیں چمن سے
گلگشت کریں چلو کہا خیر
کیا جانے کہ ہوگی سیر میں سیر
چل پھر کے ہنسی ہنسی میں پوچھا
کھونا ملنا بہن یہ کیا تھا
روح افزا نے کہا کہ ہمشیر
میں نے یہ سنا کہ تو ہے دلگیر
واللہ کہ چھان کر خدائی
تیرے پیارے کو ڈھونڈھ لائی
سمجھی وہ ہنسی کہا سڑن ہو
نادان ہو کیا کھون بہن ہو
ہم کو یہ ہنسی نہیں گوارا
پیارا ہوئیگا وہ تمھارا
پیارا جو نہ تھا تو کھوگئیں کیوں
بدراہ بھی آپ ہوگئیں کیوں
بولی وہ آشنا تمھارا
پیارا نہیں پیاری کا ہے پیارا
گر اس کی تلاش میں میں کھوئی
بدراہ نہ کہہ سکیگا کوئی
جو چاہو کہو جواب کیا دوں
قایل نہیں ہوتی ہو دکھا دوں
وہ جوگی وہ دھونی اور وہ آسن
دکھلایا تو تھی اسیکی جوگن

جذبات کی نغمہ سرائی:۔

منھ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل؟
جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہاتھ اسپہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے

تھرائیں خواصیں صورتِ بید
اک ایک سے پوچھنے لگی بھید

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون
بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون

شبنم کے سوا چرائنوالا
اوپر کا تھا کون آنے والا

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس
غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا
پتلی وہی چشم حوض کا تھا

نام اُس کا صبا نہ لیتی تھی ہیں
اُس گل کو ہوا نہ دیتی تھی ہیں

او باد صبا ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا

اشارات وکنایات کا طلسم :-

جب پردۂ صبح ہو گیا فاش
خنداں خنداں اُٹھا وہ بشاش

اُس غنچہ دہن کا مسکرانا
بے رنگ بکاولی نے جانا

ہنستے ہنستے کہا ہنسے کیوں
ہنستا نہیں بے سبب کوئی یوں

بولا وہ کہ خواب دیکھتا تھا
آتش پہ کباب دیکھتا تھا

بولی وہ کہ ہم بتائیں تعبیر
دل سوزی کرے گا کوئی دلگیر

بولا وہ کہ رات کو افق میں
خورشید تھا آتش شفق میں

بولی وہ کہ مہر سے شب روز
عالم میں رہو گے رونق افروز

بولا وہ کہ اک مقام ہو تھا
گلزار خلیل سر بسر تھا

بولی وہ بشر ہو تم دلاور
سرسبز ہو قوم آتشی پر

بولا وہ کہ دیکھی اک شبستاں
شعلہ ہوا انجمن میں رقصاں

بولی وہ کہ شعلہ میں پری ہوں
جو ناچ نچاؤں ناچتی ہوں

بولا وہ کہ جب ہوا اُجالا
بخشا مہ انجمن نے بالا

ہالا سہ انجمن کا کیا تھا؟ وہ ہار تھا جو گلے پڑا تھا!!
گھبرائی پری کہ ہیں! یہ کیا ہے؟ بولا وہ کہ ہار نولکھا ہے!!
کاندھے پہ تھا جس کے رات ڈالا پہچانتی ہو وہ طبلے والا

صنعت طرازی کے ساتھ الفاظ کی سادگی اور قافیوں کی چستی۔

تو باغ ارم سے لے گیا گل تو مجھ سی پری کو دے گیا جل
مجھ کو ترے باپ سے ملایا مجھ کو یہ ملا کہ تجھ کو پایا
جو جو اسرار تھے نہانی سب مجھ سے سنے تری زبانی
کیا لطف جو غیر پردہ کھولے جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
ابتک وہ ہیں خارجی کی جی میں جلد آ کہ ہے مصلحت اسی میں
آئیگا تو درگزر کروں گی ورنہ میں بہت ساغر کروں گی
کانٹوں میں اگر نہ ہو الجھنا تھوڑا لکھا بہت سمجھنا

اختصار اس مثنوی کا بیمثال ہے۔ ایک شعر درمیان سے حذف کیجئے تو ساری داستان برہم ہو جائے۔

طوطا بنکر شجر پہ آ کر پھل کھا کے بشر کا روپ پا کر
پتے۔ پھل۔ گوند چھال پکڑی اُس پیڑ سے لیکے راہ پکڑی

گھر بار سے کیا فقیر کو کام کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام
پوچھا کہ سبب؟ کہا کہ قسمت پوچھا کہ طلب؟ کہا قناعت

تنہا اُسے دیکھ کر کہا۔ ہیں! محمود! کیا ہوئیں؟ کہاں ہیں"

یہ کہہ کے اُٹھا کہ "لو جان ۔۔۔ جاتے ہیں"۔ کہا "خدا نگہبان"
پوچھا کہ کدھر سے آئے کیا نام ۔۔۔ بولا کہ وہ نام سے ہے کیا کام
تیورا کے وہیں وہ بار بردوش ۔۔۔ بیٹھا تو گرا۔ گرا تو بیہوش
جھنجھلا کے۔ ڈرا کے غل مچا کے ۔۔۔ سمجھا کے۔ دبا کے دست پا کے
من چھین کے چوری کے بہانے ۔۔۔ بھیجا کھلے بند دن قید خانے

(نازک خیالی کا کمال)

چھالے پڑیں گال اگر چھوئی ہوں ۔۔۔ کاٹے ڈسیں بال اگر چھوئی ہوں
سیّاح کو کیا قیام سے کار ۔۔۔ شبنم نہیں جاگزین گلزار
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا ۔۔۔ جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

اشعار کہاں تک نقل کئے جائیں۔ اول سے آخر تک صنائع و بدائع کا دریا موجزن ہے جب تک اردو زبان ہندوستان میں زندہ ہے یہ نظم[1] سخن فہموں کے گلے کا ہار رہیگی اور سحر البیان کے برابر اس کی عزت و توقیر ہوگی۔

---

[1] سنہ ۱۳۱۱ھ میں ایک غیر معروف شاعر ریحان الدین خان ریحاں نے گل بکاولی کا قصہ نظم کیا تھا جس کا ایک نسخہ زمانۂ حال میں دستیاب ہوا اور نومبر سنہ ۱۹۰۸ء کے مخزن میں اُس مثنوی پر مفصل ریویو کیا گیا۔ اُس مثنوی کا تاریخی نام "باغ وبہار" بتایا جاتا ہے۔

یوں کہتی ہیں راویان آگاہ ۔۔۔ تھا شرق کی سرزمین کوئی شاہ
تھا زین ملوک نام جس کا ۔۔۔ دوران فلک غلام جس کا

اسی مضمون کو نسیم یوں لکھتے ہیں:—

پورب میں ایک تھا شہنشاہ ۔۔۔ سلطان زین الملوک ذیجاہ
لشکر کش و تاجدار تھا وہ ۔۔۔ دشمن کش و شہریار تھا وہ

ریحان کی مثنوی مقبول نہ ہوئی۔ اور آج اس کا کوئی دوسرا نسخہ تلاش سے نہیں مل سکتا۔ گارسن ڈی ٹاسی نے لکھا تھا کہ اس مثنوی کا نام "خیابان ریحان" ہے۔ مخزن کے تبصرہ نگار نے اس کا نام "باغ و بہار" تجویز کیا ہے۔ معلوم نہیں کہ دونوں نام ایک ہی مثنوی کے ہیں یا یہ مختلف نظمیں ہیں۔

نازک خیالی اور سخن آفرینی کے ساتھ واقعہ نگاری نسیم کا حصہ تھا۔ تقلید کی بیشتر کوششیں ناکام رہیں ملک الشعرا قاضی صادق علی خان اختر نے ایک مثنوی "سراپا سوز" لکھی۔ نہ بیان میں روانی تھی نہ زبان میں شعلہ فشانی۔ افسانہ بھی دلچسپ نہ تھا۔ دختِ زرگر کی کہانی بجھکر رہ گئی۔ (رئیس زادہ جوگی بنکر آتا ہی)

گرد و پیش اُس کے ایک جم غفیر　　ہمدم گریہ سب صغیر و کبیر
خاک اڑاتا تھا اپنے سر پہ کوئی　　ہاتھ رکھے ہوئے جگر پہ کوئی
کوئی کرتا تھا اس طرح نالے　　جس سے سینے کے پڑ گئے لالے
لوگ تھے گرد ماتمی سج سے　　بیچ میں وہ جوان تھا اس دھج سے
تن کی اُس کے بھبھوت سی یہ نمود　　جیسے دُرِّ یتیم گرد آلود
سر پہ یوں زر کے اِنڈوی کی پھبن　　ہوئی سورج کے گرد جیسے کرن
کنڈل اُن کانوں میں یہ آفت ہوش　　مہر و مہ جسکی چھب کے حلقہ بگوش
زیب بخش گلو تھا یوں زُنّار　　ہو بندھا جیسے آنسوؤں کا تار
غرض اس شکل سے جو آتا تھا　　خلق کا جی ہی نکلا جاتا تھا

آتش کے نامور شاگرد میر وزیر صبا نے ۱۲۶۴ھ میں ایک مثنوی "صیدیہ" لکھی اپنے مربی نواب محسن الدولہ کے سیر و شکار کی حکایت نظم کی صنایع و بدایع کے طلسم بنائے۔ محاورات کے دریا بہائے لیکن قبولیت عام کا شکار نہ کر سکے۔ بہر حال اُستاد کا کلام ہے۔ اور موتیوں سے تولنے کے قابل ہے چند اشعار سنئے:-

عجب ایک بستی لب آب تھی　　کہ جو بات تھی اُسکی نایاب تھی
جسے دیکھئے حسن میں وہ پری　　وہ صورت کہ دیکھا کرے آدمی
لٹک۔ اچپلاہٹ۔ شرارت اُمنگ　　دمکتا وہ کندن سا چہروں کا رنگ
وہ چھوٹے ہوئے گیسوئے عنبریں　　کمندیں لئے غارت نقد دیں

وہ لہنگے نمونے تھے گلزار کے | اور اُن پر دوپٹے وہ زرتار کے
وہ باتیں جو سنئے تو کیا بات ہے | وہ چالیں کہ کبک دری مات ہے
وہ دریا کا عالم وہ جنگل کا روپ | وہ دھانوں کے کھیتوں پہ بدلی کی دھوپ

میر حسن کا شعر یاد آگیا:—

درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ | یہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو میاں دلگیر نے امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے عہد میں ایک مثنوی امین آباد کی تعریف میں لکھی جو نایاب ہے۔ رامپور کے سرکاری کتب خانہ میں ایک نسخہ نظر سے گزرا۔

زہے امجد علی خاقان دوران | ہزاروں جھکتے ہیں دارا سے دربان
وزیر عصر ہے خیر مجسم | امین الدولہ دستور معظم

(تعریف امین آباد)

جو دیکھے خواب میں یوسف یہ بازار | تو جان و دل سے ہو اُس کا خریدار
نہ اس بازار کو بازار کہئے | اگر کہئے تو پھر گلزار کہئے
وہاں انبار ہے خلقت کی بہبود | سوائے ظلم ہر اک شی ہے موجود
جو کوچہ ہے وہ دولت سے بھرا ہے | وزیر ہند کی دولت سرا ہے

۱۲۶۷ھ میں منشی جگناتھ خوشتر لکھنوی نے رامائن کا ترجمہ کیا:—

سروش غیب نے فرمایا سنکر | ریاض نور ہے تاریخ خوشتر

حکایتیں دلچسپ اور نتیجہ خیز تھیں۔ قافیے بھی چست تھے۔ مگر تشبیہات و استعارات کے ساتھ داستان نگاری میں کامیابی نہ ہوئی اور سخنوروں نے اس نظم کی کچھ قدر نہ کی۔ انھوں نے بھاگوت کا ترجمہ بھی نظم کیا تھا جو اب کمیاب ہے:—

بنائی ہیں نے رامائن جو زین پیش | تو مارا مجھ پہ اک زنبور نے نیش

کہ سوزش اُسکی ہو اب تک جگر میں | کھٹکتا ہے وہ کانٹا دوش و بر میں
جو شاعر ہیں کہیں گے پڑھ کے اک ساتھ | کہ یہہ دونوں ہیں تصنیفِ جگنا تھ
پدر کا میرے منالال تھا نام | ہوا آغاز سے اُس کا خوش انجام

اس ترجمہ کو رامائن کے برابر بھی کامیابی نہ ہوئی۔

اُسی سال لالہ حسین بخش واقف لکھنوی نے کنور دھنپت رائے کی شادی کے احوال میں ایک مثنوی لکھی اور ہندؤں کے شادی بیاہ کی سب رسمیں نظم کر دیں۔

ہوئی یہ مثنوی جس وقت اتمام | "بہارستانِ شادی" رکھدیا نام

نواب علی بہادر علیؔ والی باندہ نے اسی ۱۲۶۷ھ میں ایک مثنوی "مہر وماہ" لکھی۔

آٹھ دس دن میں مثنوی یہ کہی | جس کی ہر بیت ابروئے لیلی
ہاتفِ غیب نے علیؔ سے کہا | باغِ معنی کھلا ہے اب زیبا ۱۲۶۷ھ

شاعری کا نمونہ یہ ہے۔

نور کا جسم نور کا جوڑا | وصف جتنا کروں وہ ہے تھوڑا
پائچوں میں بہار کی رنگت | ہر کلی جس کی ہے گلِ جنت
کفشِ پا کا نہ کیوں بڑہے شہرہ | ہر ستارہ ہے غیرتِ زہرہ
پیاری پیاری ہنسی کی کیا کہئے | ہونٹ دانتوں سے کاٹتے رہئے
پیچ باتوں کے دلپہ پڑتے ہیں | دمِ تقریر پھول جھڑتے ہیں

ہادی علی خان بیخودؔ لکھنوی شاگرد خواجہ وزیر نے ایک مختصر مثنوی آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے جلسۂ رہس کی تعریف میں لکھی۔ زہے نظم عالم پسند تاریخ اتمام ہے۔ (۱۲۶۹) فصاحت وبلاغت کا دریا موجزن ہے

بادشاہ کی تعریف ایسے الفاظ میں کی کہ آج اُس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔

ملک رتبہ واجد علی شاہ | پری چہرہ۔ یوسف لقا۔ رشکِ ماہ
فروغِ حسینانِ عالم ہے وہ | حقیقت یہ ہے جانِ عالم ہے وہ
ہے بیشک وہ سلطانِ عالم پناہ | اور اقلیم حسن اُسکی ہے تختگاہ

مثنوی کا ایک سین ملاحظہ ہو۔ (افیوں کی بہار)

بھلا ہم کہاں اور یہ گلشن کہاں | غضب ہے چلیں گر نہ یاں چسکیاں

.. ..

یہ چینی کی ڈبیا میں افیوں نہیں | ہے زنگی کے قبضہ میں اقلیم چین کو
کب افیوں ہے ساغر میں جلوہ کناں | سویدا دلِ جام کا ہے عیاں
یہ افیون ہے جام بلور میں | کہ ہے مردمک دیدۂ حور میں
کروں میں پیالی کی تعریف کیا | بعینہ یہ ایک پھول ہے پوست کا
پیالی اگر غیرتِ بدر ہے | تو افیوں رشکِ شبِ قدر ہے

اسی دور میں شیخ امان علی سحر لکھنوی شاگرد برق نے بھی ایک مثنوی لکھی۔

شب و روز ہے یہ دعائے فقیر | الٰہی طفیلِ جنابِ امیر
زمانہ کا یارب کوئی غم نہ ہو | کبھی محفلِ عیش برہم نہ ہو
قیامت تک اختر کا شہرہ رہے | شبِ ماہ میں رقصِ زہرہ رہے
خدا رکھے اُس شہر کی خیر کو | عجب باغِ فردوس ہے سیر کو
عجب دم ہے دنیا میں دم رہے | یہی دور سلطان عالم رہے

منشی گوبند پرشاد فضا لکھنوی نے اسی زمانہ میں شیرین خسرو کا مشہور قصہ نظم کیا۔

ہوا شاہ اودھ وہ شاہِ عادل | نہیں جمشید بھی جسکے مقابل
زہے واجد علی سلطان عالم | تن جود و سخاوت جان عالم

خدا نے یہ دیار وے دل افروز | خجل ہیں ماہ و خورجس سے شب و روز
نسیم فیض شہ سے رنگ و بو ہے | کہ رشک خلد شہر لکھنؤ ہے
اُسی سلطان کا میں بھی تھا نمکخوار | شباب عمر تھا اور ذوق اشعار
طبیعت تھی غزل گوئی پہ مائل | کہ تا ہو کچھ مذاقِ شعر حاصل
بہت کی صرف اسمیں اپنی اوقات | پھر آخر دل میں ٹھہرائی یہی بات
کہ کرد دلچسپ قصہ کوئی منظوم | بیاں واقعی ہو جس سے معلوم
اسی تجویز میں رہتا تھا دل سوز | طبیعت پر خیال آیا اک روز
کہ گزرا شاہ ملکِ خوش کلامی | سخنداں وسخن پرور نظامی
لکھی اک مثنوی دلچسپ و نیکو | بیاں ہی قصۂ شیریں و خسرو
زبانِ فارسی میں وہ بیاں ہی | زمینِ شعر میں دریا رواں ہی
یہ جی چاہا کہ گر ہندی زباں ہو | تو آسانی سی حظِ داستاں ہو
بہت ہی ہند میں ہندی کا چرچا | کہ مشکل ہی سمجھنا فارسی کا

قصہ دلچسپ ہی اور زبان صاف۔ مثنوی نے شہرت پائی اور متعدد بار طبع ہوئی۔

خاتم السلاطین واجد علی شاہ اختر نے کئی مثنویاں کہیں۔ شاہ ذیجاہ نے محاورات کے دریا بہائے۔ خدام بارگاہ نے ہر قطرہ سے تحسین و آفرین کے باغ لگائے لیکن سخن سنجوں کی بزم میں اس شعبدہ پردازی کی کچھ قیمت نہ ہوئی۔ دریائے تعشق کا قصہ دلچسپ تھا۔ الفت خان حباب نے ڈراما بنا کر شوقین نوجوانوں کو مدتوں ”غزالہ ماہرو“ کا شکار رکھا مگر مثنوی اُچھالنے کا حباب میں دم نہ تھا۔ وہ بدستور ڈوبی رہی۔ تاہم زبان صاف و سلیس ہے۔ بیان میں درد ہے ”ملک الکلام“ نہ سہی ”کلام الملک“ ضرور ہے

لال پری خودکشی کے لئے تیار ہوتی ہے:۔

وہ رشکِ قمر نہا چکی جب
پہنا کفن اُس نے گیروا سب

تسبیح گلے مین ایک ڈالی
اور مانگ بھی بالون مین نکالی

بالون کو بھی کر دیا پریشان
حسن اُس سے ہوا مگر دوچندان

کافور لگایا سب بدن میں
کچھ عطر بھی مل دیا کفن میں

عمامہ بھی باندھا اُس نے سر پر
اور گیروکی اوڑھی ایک چادر

جسم اپنا چھپا کے سب کفن مین
وہ شمع رُخ آئی انجمن میں

اک ہاتھ میں اُس کے خنجر تیز
اور ایک میں جام سم سے لبریز

اک لونڈی کے ہاتھ میں اگر سوز
رومال لئے کوئی جگر سوز

وان ناچ کا شغل ہو رہا تھا
غل ساز طرب کا جا بجا تھا

مطرب سبکو رجھا رہے تھے
اختر کی غزل یہ گا رہے تھے

عاشق کو نہ اِس قدر ستاؤ
پچھتاؤ گے اب بھی باز آؤ

ہمتو اُٹھتے ہیں اب یہان سے
چاہو جسے پاس تم بٹھاؤ

عاشق نہ ملیگا ہم سا کوئی
جو کہتے ہیں اب بھی مان جاؤ

بادشاہ کی مثنویان "افسانۂ عشق" اور "بحر اُلفت" اب کمیاب ہیں۔ اُن کا بھی نمونہ دیکھئے۔
(از افسانۂ عشق)

مشوش جو تھی مادر سیمتن
بہت اُسکے دلکو تھا رنج و محن

یہ تدبیر کرتی تھی وہ سینہ چاک
سبیل ایسی نکلے کہ جن ہو ہلاک

بہت دھیان گھر کا کہ تھوڑا کیا
وہیں اپنی گھوڑی کو کوڑا کیا

(از بحر الفت)

مہر کی ہو یہ روشنی جب تک　　رات کی ہو یہ تیرگی جب تک
جب تلک نور اس سحر میں ہو　　جب تلک یہ ضیا قمر میں ہے
ماہ و پرویں کی جب تلک ہو چمک　　زہرہ اور مشتری ہیں یہ جب تک
گردش ہر ستارہ ہے جب تک　　برج بارہ ہیں یہ برائے فلک
جاہ و حشمت زیادہ ہو اور فوج　　رہے یا رب سدا ہمارا اوج
بڑھے ہر وقت اوج جاہ و سپاہ　　تا قیامت رہے یہ دولت و جاہ

مظفر علی خان اسیر لکھنوی نے سنہ ۱۲۷ھ میں مثنوی "درۃ التاج" لکھی۔ استاد کا کلام ہے۔ کسی لفظ پر حرف گیری کی مجال نہیں مگر قبولیت نصیب نہ ہوئی۔

راتوں کو ہمیشہ شغل زاری　　دن بھر تپ غم سے بیقراری
طالع سے تمام روز لڑنا　　شب خواب میں چونک چونک پڑنا
نالوں سے دہن کا گرم بازار　　ہمسائے تمام رات بیدار
کاشانۂ غم میں شب کو مسکن　　داغوں کے چراغ گھر میں روشن
اشکوں کا وہ متصل ٹپکنا　　دیوار پہ سر کو دے پٹکنا

آغا حسن نظم لکھنوی نے ایک مثنوی "لذت عشق" نام سحر البیان کے جواب میں لکھی وہی بحر ہے مگر روانی زیادہ ہے اُسی طرز کا قصہ ہے لیکن بیچیائی میں دس بیس قدم آگے ہے مصحفی کی بحر المحبت کو جو نسبت دریائے عشق سے تھی وہ بھی اس مثنوی کو سحر البیان سے نصیب نہ ہوئی۔ میر حسن کی جوگن بصیرت افروز ہو چکی ہے۔ نظم کا "فقیر" دیکھئے۔

رنگا گیروا اپنا سارا لباس　　مہیا کیا فقر کا سب اساس
وہ بیراگی اک بانس کی پیچدار　　کہیں شکل آہو کہیں شکل مار

وہ تسمہ وہ کفنی وہ تہمت لنگوٹ — تکلف کی جس میں لگی سبز گوٹ
سمندر کا بن اک منگا نا جیل — بنائی وہ کشکول اک بے عدیل

"بدر منیر" کی بیتابی فراق ملاحظہ ہو چکی ہے۔ نظم کی ہیروین کا سوگ دیکھئے:۔

تلاطم میں شب بھر طبیعت رہی — نہ رنگت رہی وہ نہ صورت رہی
بہت آگیا فرق اوقات میں — وہ کھسیانا ہو جانا ہر بات میں
وہ گرمی سے رُخ تمتمایا ہوا — وہ رونے سے منھ بھر بھرایا ہرا
خوشی ہے نہ راحت نہ عیش و طرب — خواصیں بھی میلی کچیلی ہیں سب
کہیں ہے جو مسند تو تکیہ نہیں — کہیں فرش تک بھی بچھایا نہیں
دروں میں ہر اک جا پہ جالی لگے — چھتوں میں ابابیل کے گھونسلے

کہاں سحر البیان کی مرصع کاری اور کہاں یہ نظم بازاری!! چہ نسبت خاک را با عالم پاک!! نظم کے وقت تک زبان بہت ترقی کر چکی تھی لیکن "ہینگے" بے تکلف استعمال کرتے ہیں اور تعقید کو بھی عیب نہیں سمجھتے۔

یہ دونوں جو ہینگے مرے میہمان — بٹھا تخت پر اُن کو تم ہو روان

صرف چند شعر یاد رکھنے کے قابل ہیں:۔

نیا پھول گلشن میں پھولا ہے آج — مسافر کوئی راہ بھولا ہے آج
بیاں کیا کروں اپنہ کیا روپ ہے — کہ سائے میں چھٹکی ہوئی دھوپ ہے
سحر تک نہ سوئی نہ سونے دیا — نہ موتی میں دھاگا پرونے دیا
لنگوٹے کو آگے بڑھا لیجئے — کرامات داتا چھپا لیجئے

آخری دو شعر اخلاقی معیار سے پست ہیں لیکن غضب کی شوخی ہے اور اردو زبان اُن کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتی۔ نواب بادشاہ محل عالم نے بھی ایک مثنوی لکھی۔ بیگماتی زبان میں منجموں اور جوگیوں کی

اسطلاحین اور شادی بیاہ کی رسمین نظم کیں۔ علم نجوم و موسیقی سے واقفیت کا ثبوت پیش کیا۔ قصہ سحر البیان کے طرز کا تھا مگر دلچسپی میں اس سے کم۔ شائستگی و متانت جنس لطیف کی تصنیف میں ہونا ہی چاہیئے وہ موجود تھی مگر درد و تاثیر کا نشان نہ تھا۔ مثنوی کی کچھ قدر نہ ہوئی۔ بیگم صاحبہ نے خاتمۂ کتاب پر دعا مانگی تھی وہ بھی قبول نہ ہوئی۔ روشنائی بھی خشک نہ ہوئی تھی کہ سلطنت چھن گئی اور راج لٹ گیا۔

رہے جب تک کہ مہر و مہ میں نور　　ہدیٔ دین کا جب تلک ہو ظہور
نوجوان بادشاہ خوش اقبال　　والیٔ لکھنؤ خجستہ خصال
جو کہ مشہور جان عالم ہے　　رونق بوستانِ عالم ہی
رہی رونق فزائے خطۂ ہند　　فخر ایران بنائے خطۂ ہند

البتہ آفتاب الدولہ قلق نے ایک طویل مثنوی طلسم الفت نام لکھکر لکھنؤ کے انداز واقعہ نگاری کی آبرو رکھی۔ جس طرح شاعروں کی زبان میں زلف یار کی درازی پائے معشوق کے لئے گاہ گاہ کمند ہو جاتی ہو ویسے ہی اس نظم کی برجستگی کو اُس کی فضول طوالت سے نقصان پہونچا۔ اگر نسیم کی طرح وہ بھی دہ یک کا قانون جاری کرتے یا غالب کی طرح کلیات کا عطر نکالتے تو شاید گلزار ارم پر خزان آجاتی مگر خیالات کی بے اندازہ وسعت۔ مضامین کے بے ضرورت پھیلاؤنے قافیے سست کر دیئے "اے حور" "اے ماہ" "خوشخو" "نیک ذات" "بے پیر" وغیرہ بھرتی کے الفاظ نے آورد و تصنع کی حد کر دی اور بعض جگہ گفتگو مقتضائے حال کے خلاف ہوگئی۔

مواصلت میں عریاں نگاری کی رسم قبیح۔ میر اثر۔ میر حسن۔ مومن اور نسیم نے رائج کی تھی لیکن قلق نے سارا کوک شاستر نظم کر دیا۔ اور سنجیدہ صحبتوں میں اس مثنوی کے نام پر ثقات کی نگاہیں نیچی ہونے لگیں۔

باین ہمہ پر لطف بیان۔ بیگمات کی شستہ زبان۔ محلات شاہی کے نادر محاورے۔ رنگیلے

جان عالم کے عہد کی معاشرت عشق آباد لکھنؤ کے رسم و رواج قصہ دلچسپ اشعار نور آگیں۔ آبدار مضامین مثنوی کو قبولیت عام کا خلعت ملا اور شاعر کی آرزو پوری ہوئی کہ بزمِ خوباں میں جب پڑھی جائے ایک ایک سن کے وجد میں آئے۔

پہلے سرزمین عشق کی تعریف سنئے :۔

شہر مانند لکھنؤ آباد — ہر گلی رشک گلشن شداد
مثل بازار مصر ہر بازار — یوسف وقت ساکنان دیار
تھی وہ کچھ سرزمین بھی الفت خیز — کوچہ کوچہ تھا اُس کا عشق انگیز
کھیل لڑکوں کا عشق بازی تھا — شمع ساں شغل جانگدازی تھا
سب جو عاشق مزاج رہتے تھے — عشق آباد اُس کو کہتے تھے

حسن آباد کی توصیف :۔

شہر دیکھا کہ آدمی تو کیسا — گر پری دیکھ لے تو ہو سکتا
ہے ہر اک گلفروش البیلا — پھول والوں کا روز ہے میلا
دلکش اک اک مقام ہی اُسکا — حسن آباد نام ہے اُس کا

فرزند عزیز کے وداع کے وقت باپ کی حالت :۔

سر کو رکھے ہوئے ہیں تکیہ پر — تر ہیں اشکوں سے مُنہ پُر زر
جب اُٹھاتے ہیں سر تو آہ کیسا — وزرا رو رہے ہیں شاہ کے ساتھ
خود تو اپنے جگر کو تھامے ہیں — لوگ اُن کی کمر کو تھامے ہیں

ماں کی حالت زار :۔

ضعف سے دمبدم غش آتے تھے — لوگ سب لخلخے سنگھاتے تھے
گاہ صحنِ محل میں آ آ کر — کھول کر سر کے بال گھبرا کر

گود پھیلا کے مانگتی تھی دعا — یارب اس داغ سے کلیجہ بچا
کبھی در سے وہ سر پٹکتی تھی — کبھی دیوانہ وار بکتی تھی
اب کوئی دم میں گھر اُجڑتا ہے — مجھ سے بچہ مرا بچھڑتا ہے

ماں بیٹے کو رخصت کرتی ہے:-

واری اب کیا یہی ارادہ ہے — رات ابھی تو بہت زیادہ ہے
اتنی کیوں جلدی کرتے ہو جانا — اب نہ روکیں گے ہم تو لو مانا
ہم کو تنہا ہی آپ چھوڑ چلے — ماں سے بے جرم منہ کو موڑ چلے
یہ تو کہدو کہ جلد آؤ گے — ہم کو تم بھول تو نہ جاؤ گے
وعدہ کر لو تو کچھ تسلی ہو — دل کو ڈھارس بندھے تشفی ہو
میرا پیشِ نگاہ حال رہے — واری اتنا ذرا خیال رہے
کہ یہ ماں گور کے کنارے ہے — بے سہارے ہے بے سہارے ہے
تم کو تو لائے گا خدا پھر یاں — میں کہاں؟ چند دن کی ہوں مہماں

معشوق کی فراق یار میں بیتابی:-

جس قدر عرصہ ہوتا جاتا تھا — شوق دیدار اُسے ستاتا تھا
چوٹ پہلے پہل جو کھائی تھی — نئے غم سے جو آشنائی تھی
وہ گلِ تر ہزار ٹالتی تھی — لاکھ صورت سے دل سنبھالتی تھی
پر نہ دل کو قرار آتا تھا — غم کلیجے کو کھائے جاتا تھا
حسرتِ دید بڑھتی جاتی تھی — وحشتِ عشق سر اُٹھاتی تھی
لیکن اک ایک سے چھپاتی تھی — دل ہی دل میں وہ کوفت کھاتی تھی
متحمل جو ہو نہ سکتی تھی — آپ ہی آپ پھر وہ بکتی تھی

باغ معشوق کی مالنوں کی شان دیکھئے :-

مالنیں چار پانچ سوکمسن | پیاری پیاری اداغضب کے دن
چوٹیاں نور کی گندھی ہوئیں صاف | جلوہ گر رنگ رنگ کے موباف
غارت ہوش پاؤں میں چھاگل | کتنی گورے یہ خوشنما ہیکل
لہنگے اطلس کے پاؤں میں پرزر | سر سے پاتک جڑاؤ سب زیور
بیلچے کھرپیاں مرصع کار | شغل آرائش چمن ہر بار

مالنیں شہزادہ سے پوچھتی ہیں کہ :-

ایسی وہ کون سی ہو مہ پارہ | جس کی الفت میں تم ہو آوارہ

شہزادہ جواب دیتا ہے :-

اے جوانانِ گلشن شاداب | خار دیتی ہیں یہ تمھیں رو جواب
کہ وہ نوبادۂ ریاض جمال | وہ ثریائے آسمان کمال
حسن میں بے مثال ہو کہ نہیں | گلِ باغ جمال ہے کہ نہیں
تمھیں غنچو چٹک کے کچھ دو جواب | دہن اُس گل کا کیا نہیں نایاب
تو ہی اُن سے اُلجھ پڑے سنبل | بوئے عارض سنگھادے نکہتِ گل

شہزادہ کو اُس باغ میں یار کی خوشبو ملتی ہے۔ وہ متحیر ہوتا ہے مالنیں نام و نسب دریافت کر رہی تھیں اسی عالم حیرت میں اُن کو جواب دیتا ہے۔ پورا اسین ملاحظہ کے قابل ہے :-

بیٹھنے کو وہ آکے بیٹھا تھا | پر دھواں سوز دل سے اُٹھتا تھا
چین لیتا نہ تھا دل مضطر | چار سو دیکھتا تھا اُٹھ اُٹھ کر
دل سے کہتا تھا وہ اسیر ستم | یاں کہیں آج اے دلِ پر غم
نکہتِ زلف یار آتی ہے | بوئے شوخ نگار آتی ہے

آتش شوق نے جو گرمایا | کھینچکر آہ سرد فرمایا
کیا کہیں تم سے کون ہیں کیا ہیں؟ | بلبل گلشن تمنا ہیں!
وطن آوارہ خانماں برباد | نامراد و ستم کش و ناشاد
آہ فرہاد کوہ غربت ہوں | قیس صحرائے درد و محنت ہوں
جھوٹ کہتا نہیں ہیں سچ جانو | کافر عشق ہوں مسلمانو!
یہ جو صورت ہے یہ جو وحشت ہے | حضرت عشق کی بدولت ہے
کیا بتائیں تمھیں نسب اپنا | اب تو ناشاد ہے لقب اپنا
کبھی انسان تھے پریزادو | دل نادان کے بس میں ہیں اب تو
نام ہے اب تو عاشق بدنام | اب تو مہر و وفا سے رکھتے ہیں کام
محو روئے حبیب کہتے ہیں | عاشق بدنصیب کہتے ہیں
سرگزشت بلا کشان نہ سنو | نہ سنو میری داستان نہ سنو
نقرہ فقرہ ہے اس کا پر تاثیر | ہو نجاؤ کہیں بلا میں اسیر

طلسم الفت ابھی تمام نہ ہوئی تھی کہ لکھنؤ نواب مرزا شوق کے زمزموں سے گونجنے لگا اور حسن و عشق، عیش و عشرت کے متوالے نغمہائے شوق سے پرجوش ہو گئے۔ فریب عشق نے رنگین مزاج نوجوانوں کی آتش شوق پر تیل چھڑکا۔ بہار عشق نے دردمندان محبت کے دل چھینے اور زہر عشق کی حسرتناک موسیقی نے سارے شہر کو دیوانہ بنا دیا۔ بندش کی صفائی زبان کی سادگی۔ بول چال کی بے ساختگی محاورات کی برجستگی نے عوام کے قلوب کو مسخر کیا۔ واقعہ نگاری اور نقش طرازی کے کمال نے خواص کی گردنیں خم کیں اور ان مثنویوں کو ایسی مقبولیت عام نصیب ہوئی کہ اگلے سخنوروں کے چراغ ٹمٹمانے لگے اور میر حسن کی سحر البیان فراموش ہو گئی۔ حاسدوں نے ان نظموں کی "لغزش مستانہ" کو پستی اخلاق سے تعبیر کیا۔

سفارشیں اٹھوا کر برسوں ممنوع الاشاعت رکھا۔ بزرگوں کی سنجیدہ صحبتوں میں ان کا تذکرہ اخلاقی جرم قرار دیا۔ لیکن شمع کی روشنی دامن سے اور چاند کا نور خاک سے چھپ نہیں سکتا۔ بہار عشق اور زہر عشق کو بقاء دوام کے دربار میں جگہ ملی اور نکتہ چین منھ دیکھتے رہ گئے۔

واجد علی شاہ کے دور میں لکھنؤ کی خانگیوں کی زبان سنئے:—

(فریب عشق)

اے نواب — ارے تو میں کہوں سبب کیا ہے | ارے تو ہی نواب مرزا ہے
ایک ہی مرشد ہو تم قصور معاف | سن چکی ہوں میں آپ کے اوصاف
بیوفائی میں دل جلانے میں | تو تو مشہور ہے زمانے میں
جعلسازی یہ تجھکو کیونکر آئی | ایک کو سائی دوسرے کو بدھائی
دور بھی ہو نگوڑے سودائی | مواہر دیگی چیچا ہرجائی
کس کے عاشق بنے ہو کیسی چاہ | میں کہاں تم کہاں معاذ اللہ
اک ذرا ہٹ کے بیٹھو منھ بنواؤ | کہے جوتی بھی مجھ کو گھی سے کھاؤ
ساتھ لے دیکھ اپنے یاروں کو | مینڈ کی بھی چسلی مداروں کو
مردوا ہووے تو جائس گت کا | جیسے دھونسا نگوڑا نوبت کا
سُن کے یہ پھبتی میں نے اس سے کہا | اب یہ نوبت ہوئی ہماری بجا
بولی چپ رہئے منھ کی کھائیے گا | اک ذرا سینک کر بجائیے گا
ہوش کی اپنے کچھ دوا کیجئے | مجھ سے ناحق نہ جو چلا کیجئے

معشوق کا سراپا میر تقی۔ میر حسن اور دوسرے مثنوی نگاروں نے بھی بیان کیا تھا لیکن بہار عشق کی حسینہ کی شان ہی نرالی ہے اور یہ خشک مضمون دلچسپ ہوگیا ہے:—

حسن یوسف بھی اُسکے آگے ماند | چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند

جلوۂ حسن رشکِ شعلۂ طور | چشم بد دور آنکھیں موتی چور
رُخ پہ وہ بکھرے بکھرے زلف کے بال | رگِ گل سے وہ ہونٹ پان سے لال
بے مسی کے وہ دانت رشکِ گہر | جانِ عاشق نثار ہو جس پر
قد میں آثار سب قیامت کے | گوری گردن میں طوق منت کے
رُخ پہ گرمی سے وہ عرق کم کم | جس طرح گل پہ قطرۂ شبنم
عکس رُخ موتیوں کے دانوں میں | بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں
آڑی ہیکل گلے میں ڈالی ہوئی | پیاری پیاری پھبن نکالے ہوئے
رگِ گل سی کمر لچکتی ہوئی | چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی
پائنچے ناز سے جو اُس نے اٹھائے | میں پکارا خدا کمر کو بچائے

جس طرح سحر البیان کی "عیش بائی" نقاشی کا بہترین نمونہ ہے ویسے ہی بہارِ عشق کی "خادمہ" مصوری کا کمال ہے:۔

اتنے میں نکلی گھر سے ایک عورت | سانولا رنگ چلبلی صورت
لال نیفہ ازار بند پڑا | گچھا ایک کنجیوں کا اُس میں پڑا
کھیلتی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی | آنکھ ایک ایک سے ملاتی ہوئی
چاق چوبند سینہ زوری میں | پھول رکھے ہوئے کٹوری میں
حسن کے دن جوانی زوروں پر | رات کی باسی مہندی پوروں پر
دھیان اک اک سے بدگمانی کا | ستیاناس ہو جوانی کا
پوچھتی آئی ہے۔ یہاں تک گھر | ہاتھ رکھے کھڑی ہو کولے پر
اپنے سایہ سے بھی بھڑکتی ہے | بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے
شرم ہے آنکھ میں نہ دل میں خطر | پھبتیاں کہہ رہی ہے اک اک پر

کھڑی اک اک کا منھ چڑاتی ہو — ہنسے دیتی ہے لوٹی جاتی ہے
چوٹی لپٹی ہے باسی ہاروں سی — لڑ رہی ہے جگت کہاروں سے

تصویر کشی کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:—

منھ دوپٹے سے ڈھانپتی اتری — خوف کے مارے کانپتی اتری
نیچی نظروں سے دیکھ بھال لیا — سر پہ آنچل الٹ کے ڈال لیا
سب حیا سے بدن چرائے ہوئے — پانچے ناز سے اٹھائے ہوئے
چال اٹکھیلیوں سے چلتی آئی — دل کو پاؤں کے نیچے ملتی آئی
گھنگھرو جوتی کے جھنجھاتے تھے — ہاں میں ہاں اور یہ ملاتے تھے
پانی پانی جو دل تھا سینے میں — جسم ڈوبا تھا سب پسینے میں
کچھ رکھائی تھی کچھ لگاوٹ تھی — کچھ حقیقت تھی کچھ بناوٹ تھی

زہر عشق کا درس عبرت نظم اردو کا گوہر شب چراغ ہے:—

اقربا میرے ہو گئے آگاہ — تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ
مشورے ہو رہے ہیں آپس میں — بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں
وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں — جبر کیونکر یہ اختیار کریں
گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس — پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس
جائے عبرت سرائے فانی ہے — مورد مرگ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
بات کل کی ہے نوجوان تھے جو — صاحب نوبت و نشان تھے جو

آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشان باقی

جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم
ہوے جا جا کے زیر خاک مقیم

اب نہ رستم نہ سام باقی ہے
اک فقط نام ہی نام باقی ہی

کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج

عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے

گردش چرخ سے ہلاک ہوئے
استخواں تک بھی انکی خاک ہوئے

تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسہ سر

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے

ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتہ
نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ

بوے الفت تمام پھیلی ہے
باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے

صبح کو طائران خوش الحان
پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

موت سے کس کو رستگاری ہی
آج وہ کل ہماری باری ہی

ہم بھی گر جان دیدیں کھا کر سم
تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم

دل کو ہمجولیوں میں بہلانا
یا مری قبر پر چلے آنا

جا کے رہنا نہ اس مکاں سی دور
ہم جو مر جائیں تیری جان سی دور

روح بھٹکے گی گر نہ پاوے گی
ڈھونڈھنے کس طرف کو جاوے گی

میرے مرنے کی جب خبر پانا
یوں نہ دوڑے ہوے چلے آنا

جمع ہولیں سب اقربا جس دم
رکھنا اُس وقت تم وہاں پہ قدم

کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم
ساتھ تابوت کے نہ رونا تم

ہو گئی تم اگرچہ سودائی
دور پہونچے گی میری رسوائی

طعنہ زن ہوں گے سب غریب و امیر — قبر پہ بیٹھنا نہ ہو کے فقیر
جب جنازہ مرا عزیز اُٹھائیں — آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
میری منت پہ دھیان رکھیو گا — بند اپنی زبان رکھیے گا
اشک آنکھوں سے مت بہائیگا — ساتھ غیروں کی طرح جائیے گا
آپ کاندھا نہ دیجئے گا مجھے — سب میں رسوا نہ کیجئے گا مجھے
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے — تا کسی شخص پر نہ حال کھلے
ہوتے آفت کے ہیں یہ پرکالے — تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے
آکے رو لینا میری قبر کے پاس — تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس
آنسو چپکے سے دو بہا لینا — قبر میری گلے لگا لینا
اگر آجائے کچھ طبیعت پر — پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جانا — پھول تربت پہ دو چڑھا جانا
دل پہ کچھ آنے دیجیو نہ ملال — خواب دیکھا تھا سمجھیو یہ خیال
رنج و راحت جہان میں توام ہے — کبھی شادی ہے اور کبھی غم ہے
ہے کسی جا پہ جشن شام و پگاہ — ہے کسی جا صدائے نالہ و آہ
مرگ کا کس کو انتظار نہیں — زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو — آج دل کھول کر گلے مل لو
حشر تک پھر یہ ہوگی بات کہاں — ہم کہاں۔ تم کہاں یہ رات کہاں
ہم تو اُٹھتے ہیں اس مکان سے کل — اب تو جاتے ہیں اس جہان سے کل
یاد اتنی تمھیں دلاتے جائیں — پان کل کے لئے لگاتے جائیں
ہو چکا آج جو کہ تھا ہونا — کل بسائیں گے قبر کا کونا

چین دل کو نہ آئے گا تجھ بن　　　　ابکی بچھڑے ملیں گے حشر کے دن

نواب مرزا شوق کے داماد حکیم آغا حسن ازل نے ایک مثنوی سحرِ عشق نام زہرِ عشق کے طرز پہ لکھی مگر سورج کو چراغ دکھانا بیکار تھا ایک شعر بھی زبان زد خلائق نہ ہوا۔ اور مثنوی نایاب ہو گئی۔

سید غلام حسین قدر بلگرامی شاگرد شیخ امام علی تحر کی مثنوی "قضا و قدر" اسی دور کی غالباً آخری تصنیف ہے۔ "کان ملاحت ہے یہ ساری کتاب" سنہ اتمام ہے۔ (۱۲۷۴ھ) امیر کی اولاد اور فقیر کی روشن ضمیری کا پرانا قصہ نظم کیا ہے۔ کہانی دلچسپ نہیں اور شعریت بھی کالمعدوم ہے

ہے تری تقدیر میں گھوڑا مدام　　　　روز کے روز آئیں خبردار دام
تو کبھی بائع ہو کبھی مشتری　　　　یونہیں رہے گھوڑوں کی سوداگری

غدر کے بعد مسلسل نظموں کی طرف ملک کی توجہ بہت زیادہ ہو گئی اور بیشمار مثنویاں تصنیف کی گئیں۔ معزول شاہ اودھ نے مٹیابرج کے مطبع سلطانی سے کئی مثنویاں شائع کیں مگر ان میں شعریت بہت کم تھی۔

(از حزنِ اختر)

مجاہد کو دولہا سے کیجئے بہم　　　　تو ہو نام اُس خوش لقب کا رقم
کروں گر ہو خرمحد سے شیر　　　　تو ہو نام لینے میں ہرگز نہ دیر
الٰہا جو آباد ہے ایک نام　　　　رہے آٹھ دن ایسی ہی خوش خرام

مرزا حاتم علی مہر لکھنوی شاگرد ناسخ کی مثنوی "شعاعِ مہر" ۱۲۷۵ھ میں شائع ہوئی۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد کا ایک فرسودہ قصہ ہے مگر مثنوی کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے

رہی مجھکو رعایت اس میں منظور　　　　کہ ہوں منظوم سب الفاظ مشہور
تکلف سے نہ آئیں تا زبان پر　　　　غلط بھی ہوں تو ہوں اُس کا نہیں ڈر

ایک شعر یاد رکھنے کے قابل ہے۔

خدا کا آسرا عشقِ صنم ہے
یہ دو باتیں ہیں جب تک دم میں دم ہے

دکن کے ایک شاعر علی تخلص نے ایک مثنوی میر حسن کی سحر البیان کے جواب میں لکھی مگر مشہور نہ ہوئی عبد اللہ خان مہر لکھنوی نے علی کا جواب لکھا۔

تخلص علی مولوی دکن
وہ لکھتے ہیں تحفہ جواب حسن

غبی فکر نا آشنائے زبان
نہ مضمون نہ بندش نہ لطفِ بیان

معانی و مطلب سے مطلب نہیں
ذرا ربطِ اشعار کا ڈھب نہیں

پھر اُس پر یہ لکھتے ہیں بے ننگ و عار
بجا ہے حسن پر کروں افتخار

نہ ہو جن کو ذرہ تمیزِ سخن
غضب ہے وہ لکھیں جواب سخن

لکھوں مثنوی ایک با آب و تاب
کہ اس کا یہ دندان شکن ہو جواب

حسن کے برابر تو ہونا محال
ہم ایسوں کو موتی پرونا محال

مگر مثنوی علی سے ملائیں
تو پھر دیکھنے والے کچھ حظ اٹھائیں

علی کی مثنوی نا پید ہو گئی اور مہر کا جواب بھی نایاب ہے۔

حافظ رحیم الدین کاکوروی نے ایک طویل مثنوی "گلزار رحیم" نام گلزار نسیم کی بحر میں لکھی اور قصہ چار درویش کو نظم کیا۔ داستان دلچسپ تھی اور انداز بیان دلکش۔ نظم اسقام و معائب سے بھی پاک تھی۔ مگر افسوس ہے کہ طبع ہونے کی نوبت نہ آئی اسوقت پیش نظر نہیں اور کوئی شعر یاد نہیں آتا جو بطور نمونہ کے درج کیا جاتا۔

سید عبد الرزاق کلامی ساکن رائے بریلی نے فتوح الشام واقدی کا اور منشی طوطا رام شایان نے مہابھارت کا ترجمہ شائع کیا۔ مگر شاعری مثنویوں سے عنقا تھی اس عہد کے اساتذہ میں سے امیر و داغ۔ محسن و منیر تسلیم و شوق نے اس صنف کلام

پر طبع آزمائی کی۔

امیر کی مثنویاں نورِ تجلی اور ابرِ کرم وغیرہ اخلاق و موعظت میں تھیں۔ صنم خانۂ عشق و مراۃ الغیب سے کچھ نسبت نہ رکھتی تھیں چند روز میں فراموش ہو گئیں ع

یاد رہنے کے نہ قابل ہو تو کیا یاد رہے

فریادِ داغ کو آفتابِ داغ سے وہی نسبت تھی جو کریما کو بوستان سے ہے۔ نہ قصہ میں دلچسپی تھی نہ بیان میں اثر۔ تاہم امیر کی مثنویوں سے زیادہ عمر پائی۔

ساقیا میں اگر دعا مانگوں　　　تو بجز مے کے اور کیا مانگوں

ساتھ اُس کے مری نگاہ گئی　　　جب نگہ تھک گئی تو آہ گئی

کل جو اُمید تھی وہ آج نہیں　　　مرضِ موت کا علاج نہیں

جان جاتی ہے دل کے آنے سے　　　موت آتی ہے اس بہانے سے

پھول بھی ناگوار تھے اُس کو　　　بار پھولوں کے ہار تھے اُس کو

(سیہ فام عاشق کی تصویر سے مخاطب ہو کر)

تجھ سے رونق نہیں ہے گھر کے لئے　　　رکھ لیا ہے نظر گزر کے لئے

مداحِ رسولِ عربی حضرت محسن کاکوروی نے تین مثنویاں صبحِ تجلی۔ چراغِ کعبہ اور شفاعت و نجات نعت میں لکھیں اور اس خشک مضمون کو ابرِ گہر بار بنا دیا۔

صبحِ تجلی میں جناب رسول کریم کی ولادت اور چراغ کعبہ میں معراج کا بیان ہے۔ مرزا

بیدل کی سی معنی آفرینی ہے اور غنیمت کا انداز بیان ۔ مجاز و ابہام کا دریا ء ذخار موجزن ہے ۔ مثلاً معراج کی شب ہے ۔ آدھی رات گزر چکی ہے ۔ مکہ کی مبارک سرزمین پر داستان کا آغاز ہے ۔ لفظ "لیل" (بمعنی شب) کی رعایت سے رات کو لیلیٰ سے تشبیہ دیتے ہیں اور سرزمین مکہ کی خاطر سے ارکان حج کا تلازم ملحوظ رکھتے ہیں۔

(از چراغِ کعبہ)

بھیگی ہوئی رات آبرو سے — داخل ہوئی کعبہ میں وضو سے
اوڑھے ہوئے لیلیٰ گل اندام — شبنم کی ردا بقصدِ احرام
گویا کہ نہا کے آئی فی الحال — جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال
کیا سعی صفا سے رنگ فق ہے — سر سے پاتک عرق عرق ہے
نامحرموں سے چھپائے چہرہ — پروین کو بنائے منھ کا سہرا
آنا کھلتا ہوا نہ جانا — اندازِ خرام صوفیانا
ناخن کی جگہ ہلال کی مد — دفتر سے طلوع کے ندارد
گرتے ہوئے ٹوٹ کر ستارے — ہیں رمی جمار کے اشارے
صورت میں غلافِ محترم کے — در پردہ طواف میں حرم کے

یا ولادت رسول کی صبح ہے ۔ سحر کی سپیدی رات کے ختم ہونے کا پیام لاتی ہے ۔ لہٰذا اُس کو پیغمبر آخر الزماں کا خطاب دیتے ہیں۔

(از صبح تجلی)

بیضاوی صبح کا بیاں ہے — تفسیر کتاب آسمان ہے
آثار سحر ہوئے نمایاں — سیپارہ لئے ہوئے ہے دوراں
واللیل کو ختم کر چکا ہے — آمادۂ دور والضحیٰ ہے

موقوف حدیث شب کی تصحیح
رکھ دیجئے طاق پر مصابیح

ہنگام سپیدۂ سحرگاہ
ساعات میں روز و شب کے واللہ

اک مخبر صادق البیان ہے
پیغمبر آخر الزماں ہے

کیفیت وحی میں ہے بلبل
ہے وقت نزول مصحف گل

سبزہ ہے کنار آب جو پر
یا خضر ہے مستعد وضو پر

نوبت ہے صدائے قمریان کی
تیاری ہے باغ میں اذان کی

محو تکبیر فاختہ ہے
قد قامت سرو دلربا ہے

اک شاخ رکوع میں رکی ہے
اور دوسری سجدے میں جھکی ہے

سوسن کی زبان پر مناجات
جاری لب جو سے التحیات

تسبیح شگوفہ یا مصور
تحریمہ تاک رب اغفر

غنچے میں ہے خامشی کا عالم
یا صوم سکوت میں ہے مریم

کیاری ہر اک اعتکاف میں ہے
اور آب رواں طواف میں ہے

لایا یہ مجاہد صبا رنگ
نافرمان ہو رہا ہے چو رنگ

کہتا ہے اشارۃً لجالو
موتو من قبل ان تموتو

شفاعت و نجات ۱۳۱۱ھ کی تصنیف ہے اور اُس کی زبان صاف ہے۔

ردی جب ہوا پرچہ آفتاب
کھلا دفتر امتحان حساب

ادہر رازداران ذی فہم و ہوش
ہمارے رفیقان خانہ بدوش

جنازوں میں حسرت کا کاندہا دئے
ہر اک مردے کا روزنامہ لئے

اُدہر موشگافان موزوں رقم
نہ ہو جنکی میزان مین کچھ بیش و کم

ترازو کو ہاتھوں میں تولے ہوئے
رعایت کے پلوں کو کھولے ہوئے

نہیں ہے کچھ آسان اے دل حساب | ہے محشر کی اک سخت مشکل حساب
ہر اک مد کا ہر اہل مد خود گواہ | دورویہ ہیں فردین کی فردین سیاہ
کچہری ہوئی گرم جب جانچ کی | ہر اک بال کی کھال کھنچنے لگی

ایک ناتمام ساقی نامہ کلیات محسن میں ہے جس کا رنگ اُن کے سب کلام سے جدا ہے۔ چند اشعار سنئے:—

زردی چھائی ہوئی رخساروں پر | سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر
یہ انگرکھے ترے گلکاری کے | جنکی کلیوں میں چبھے ہیں کانٹے
کامدانی کا پہننا جوڑا | لُٹ گیا تیرا اشہانا جوڑا
باتیں کرتے ہو تو رک جاتے ہو | آپ ہی چھیڑ کے شرماتے ہو
شہر کا سیر و تماشا چھوڑا | چاندنی چوک کا رستا چھوڑا
ہوش میں آؤ سمجھ والے ہو | تم تو بے مے پئے متوالے ہو
چاندنی پچھلے پہر کی کب تک | روشنی شمع سحر کی کب تک
جھوٹی کھاؤ نہ ہزاروں قسمیں | پھینکدو دل جو نہیں ہے بس میں

شیخ ناسخ کے شاگرد رشید سید اسمٰعیل حسین منیر نے مثنوی "حجاب زناں" لکھی۔ نصیرالدین حیدر کے عہد کا ایک اخلاقی قصہ لڑکیوں کو تعلیم کا شوق دلانے کے لئے نظم کیا۔ شاعرانہ حیثیت سے اُس کا درجہ خود شاعر کی زبان سے سنئے:—

حال جو کچھ سُنا کیا موزوں | نہیں اس میں لطافت مضموں
اس میں اکثر نہیں ہیں وہ قیدیں | جو ہیں میرے قصیدے غزلوں میں
سیدھی سیدھی زبان ہے اس میں | سادہ سادہ بیان ہے اس میں

لکھنؤ مرحوم کی تصویر:—

لکھنؤ کا جو شہر ہے مشہور / اب ہو ویران پہلے تھا معمور
کبھی اُس شہر کا یہ تھا عالم / ڈھونڈھے ملتا نہ تھا کسی کو غم
سب وہاں تھے خوشی کی عالم میں / غم جو تھا بھی تو تھا محرم میں
شادی ارزان تھی عیش بستا تھا / رات دن مُن وہاں برستا تھا
ہاتھ خالی بھی جو وہاں آتے / لکھنؤ سے بھری پوری جاتے
مٹ گئی سلطنت وہاں کی جب / اڑ گیا چین عیش سب کا سب
کھاتے تھے جو ہزاروں کو دیکر / پھرتے ہیں ٹکڑے مانگتے گھر گھر

گرمی کی تکلیف اور جنگل کی وحشت :-

فصل گرمی کی اور وہ جنگل / دھوپ کے مارے ہو گیا بیکل
ہر طرف تھا غضب کا سناٹا / بن بڑا سائیں سائیں کرتا تھا
جلتی تھی لو زمین تپتی تھی / روح گھبراتی تھی تڑپتی تھی
دونوں تلووں میں پڑ گئے چھالے / کانٹے چبھتے تھے جس طرح بھالے
گرم لو تن کو بھونے دیتی تھی / بھاڑ کی طرح گرم رہتی تھی
کہیں اڑتا ہوا بگولہ تھا / کسی جانب مدار پھولا تھا
راہ کانٹوں نے ہر طرف گھیری / سوکھی سوکھی لگی تھی جھربیری
جھاڑ کانٹوں کے تھے ببول کہیں / کوئی پتا نہ جن میں پھول کہیں

(ہجر کی مصیبت)

جب سے دولہا جدا ہوا اُس کا / جینے سے دل خفا ہوا اُس کا
کوئی کھانا اُسے نہ بھاتا تھا / بات کرنا بھی خوش نہ آتا تھا
مِسّی مہندی بھی ترک کی اُس نے / کنگھی چوٹی بھی چھوڑ دی اُس نے

ہنسکے بولے کسی سے کیا ممکن ۔۔۔ نہ بدلتی تھی کپڑے دس دس دن
رنگ چہرے کا زرد آنکھیں لال ۔۔۔ میلے کپڑے چکٹے سر کے بال

مثنوی میں زبان کی سادگی اور متانت بیان کے ساتھ درد و تاثیر بھی ہے۔ آخر کے دو چار شعر جو میلے ٹھیلوں میں جانے والی عورتوں کی مذمت میں لکھے ہیں حذف کر دیے جائیں تو یہ نظم اس قابل ہے کہ لڑکیوں کے درس میں مقرر کی جائے۔ اور زمانۂ حال کی روشن خیال خواتین اس نصیحت نامہ سے فائدہ اٹھائیں:۔

اُن کی مشہور ترین مثنوی معراج المضامین ہے جس میں حضرات ائمہ علیہم السلام کے معجزات نظم کئے ہیں۔ فصاحت و بلاغت۔ صداقت و تاثیر کے اعتبار سے مثنوی کا پایہ بہت بلند ہے۔ نظم منور تاریخی نام ہے ۱۲۰۶ھ ہجری کی تصنیف ہے۔

نہیں بھاتی مجھے خلوت کسی کی ۔۔۔ پسند آئی ہے صحبت بیکسی کی

یہ دنیا بھی ہے اک دریائے مواج ۔۔۔ ہوئی ہیں کشتیاں لاکھوں کی تاراج

سنہری تھالیاں چوکٹے سے روشن ۔۔۔ بتاسے۔ دوب تلسی۔ دھوپ چندن
بھری مانگوں میں سیندور اور صندل ۔۔۔ گلابی مد بھری آنکھوں میں کاجل

بڑھی شعلہ کو لیکر باد صرصر ۔۔۔ قیامت ہٹ گئی دامن بچا کر

(شکایت آغاز پیری و ناتوانی)

پلا ساقی شراب کامرانی ۔۔۔ کہ دل سے دور ہو یاد جوانی
ذرا نشہ میں کم ہو کچھ تاسف ۔۔۔ نہ یاد آئے مجھے گم کردہ یوسف

جوانی سے چمک تھی صورتِ بدر | سکندر تک تھی اس آئینہ کی قدر
عبث اس پھول کی آب زرو ہے | ہزاروں کوس اب وہ رنگ بو ہے
جوانی تک توانائی کی تھی دھاک | گئی اکسیر باقی رہ گئی خاک
ابھی شیشے میں کچھ کچھ مے ہے باقی | ابھی مہمان ہے کچھ دیر ساقی
نگہ بے رونقی آتی چلی ہے | اداسی چھاؤنی چھاتی چلی ہے
تنا تھا جو بدن مانند شمشاد | وہ نخل بید سے ہوتا ہے ہمزاد
جدا اب پوست سے ہیں استخواں یوں | کہ دستانوں میں جیسے انگلیاں ہوں
نکما جھریوں سے یوں بدن ہے | کہ گویا بورئے کا پیرہن ہے

روایات پرستوں کے طبقہ میں مثنوی پسند کی گئی۔ لیکن قبولیت عام حاصل نہ کر سکی۔

منشی امیر اللہ تسلیم نے پہلی مثنوی واجد علی شاہی دور میں لکھی تھی۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد جہانداری کا ایک فرسودہ قصہ نظم کیا تھا اور اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا تھا افسانہ پہلے سے مشہور تھا۔ انداز بیان میں ندرت نہ تھی۔ عیش و عشرت کے بندوں نے نالۂ تسلیم کی کچھ قدر نہ کی۔

عاشق کے بوڑھے باپ کی تعریف کرتے ہیں:۔

ادب سے اس کو وقتِ خط کتابت | خضر لکھتے سدا "حضرت سلامت"

معشوق کے سراپا میں فرماتے ہیں:۔

حنا کچھ پاؤں پر ایسی پسی ہے | اسے جب دیکھو قدموں سے لگی ہے

مومن دہلوی سے بالواسطہ تعلق کا فیض ہے:۔

پریشانی اثر ہے شادمانی | اجل تعبیر ہے خوابِ جوانی
کیا واماندگی نے دل کو بیتاب | ہوا وقتِ سحر شرمندۂ خواب

دوسری مثنوی "شام غریباں" نام ۱۲۷۹ھ میں تصنیف کی اور ادب اردو کے دامن میں بلاغت کے موتی ٹانکے۔ قصہ دلچسپ نہ تھا۔ بیان میں شوخی نہ تھی۔ کلام کی پختگی کی کافی داد نہ ملی۔ عاشق عالم وحشت میں ایک درویش حق آگاہ سے ملاقی ہوا۔

کہا اس نے کہ تو آیا کہاں سے؟ — کہا آبادیٔ ہندوستان سے
کہا مقصود اس غربت سے کیا ہے؟ — کہا "ترکِ تمنا مدعا ہے"
کہا "کافر ہے یا پابندِ اسلام"؟ — کہا "بے قید کو مذہب سے کیا کام"
کہا "کس شغل میں رہتا ہے سرشار"؟ — کہا "نفیٔ عدد۔ اثبات دلدار"
کہا "کچھ تو مصیبت آشنا ہے"؟ — کہا دل میں غمِ الفت بھرا ہے"
کہا "پھر کس لئے محنت سفر کی"؟ — کہا "ہوں بوئے گل۔ عادت سفر کی"
کہا جائیگا اب آخر کہاں کو؟ — کہا "تقدیر لیجائے جہاں کو"

ناچ گانا ہوتا ہے:۔

موافق ساز سے آواز ہو کر — ہوئی پردے سے باہر راز ہو کر
وہ انگیز بدن انداز کے ساتھ — وہ لینا منھ پہ آنچل ناز کے ساتھ

جنگل کا سماں:۔

نہ سایا تھا نہ برگِ خشک و تر تھا — برنگِ شاخ آہو ہر شجر تھا
کفِ سائل کی صورت چشمۂ آب — ہوائے گرم سے ہر مرغ بیتاب
حرارت سے دھواں اٹھتا جگر میں — تپش سے آبلہ پڑتا نظر میں
یہ عالم دیکھ کر دشتِ بلا کا — نظر میں پھر گیا سامان قضا کا

تیسری مثنوی "صبح خنداں" نوعمری میں دیکھی تھی۔ اب تلاش سے نہیں ملتی اور اس کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا شام غریباں سے بہتر نہ تھی۔

"دل وجان" ان کی آخری مثنوی ہے:-

ابھی ہے کہ سب طرح بُری ہے
یہ پانچویں مثنوی مری ہے

کلام کی پختگی نمایاں ہے مگر "شام غریباں" کو نہیں پہونچتی۔ شاہکار ایک ہی ممکن ہے۔

سید مظفر علی خان آسیر کے نامور شاگرد منشی احمد علی شوق نے ۱۳۰۵ھ میں اس دور کی بہترین عاشقانہ مثنوی لکھی۔ میر حسن کی مصوری نسیم کی نازک خیالی۔ نواب مرزا شوق کی خوش بیانی کو دلیل راہ بنا کر خیالات ومحاورات کا طلسم بنایا۔ قصۂ طلسم اُلفت سحر البیان اور دریائے تعشق کا عطر مجموعہ تھا۔ دلچسپی میں اُن سے کم مگر تہذیب وسنجیدگی میں زیادہ۔ نئی نئی تشبیہیں ایجاد کیں محاورے خوش آئند اسلوب سے باندھے۔ بول چال کی صفائی اور بندش کی خوبی سے نظم میں چار چاند لگادئے۔ گلزار نسیم کی بحر تھی اور اسی کی سخن طرازی کی تقلید۔ اختصار کی کوشش کی مگر یہ سعی لاحاصل ثابت ہوئی آورد وتصنع کا پردہ بُری طرح فاش ہوا اور بعض جگہ بے ضرورت طول ہوگیا۔ بے جان اشیا میں جان ڈالنا اور اُن سے ہم کلام ہونا نسیم کا نیرنگ تھا۔ لیکن جو خال حد سے بڑھا وہ مسا ہوا۔ یہاں طوالت نے اس شعبدہ پردازی کی قلعی کھول دی۔ مثنوی درد سے خالی تھی۔ لبوں پر "واہ واہ" آئی مگر دل سے "آہ" نہ نکلی۔ پہلے تشبیہات کی بہار دیکھئے جو تمام دنیا میں شعر کی روح رواں سمجھی جاتی ہے۔

(منقبت اہل بیت)

گویا قد مصطفےٰ شجر تھا
اس میں کوئی گل کوئی ثمر تھا

(مناجات)

ہر صفحہ کتاب کا فلک ہو
نقطوں میں ستاروں کی چمک ہو

صفحے پہ ہو اُن کی ضو فشانی
نسر دی بوٹی کی کامدانی

(سراپا)

کیا رنگ کھوں شگفتگی کا | اک پھول کھلا تھا چاندنی کا
گیسو تھے کہ دام تھے بلا کے | ابرو تھے کہ نیمچے قضا کے
بے خود سے تھے شراب پینے والے | مستی میں الٹ دیے پیالے

گالوں پہ جو چھائی ہے اداسی | دو پھول تو ہیں مگر ہیں باسی
چشمہ پر تو کسی جبین کا | نگاہ گھونگھٹ کسی حسیں کا
تھی بیل زمیں پہ جال کھوے | کالی دیبی تھی بال کھوے
ہلکی بینا سی ایک تھی ناؤ | جھولا جھولو جو اس پہ چڑھ جاؤ
حیرت تھی کہ لوچ کس قدر ہے | یہ بال کمانی یا کمر ہے
قدمیں زیور کچھ اس قدر تھا | گھنگچی کا پھلا ہوا شجر تھا
دھانی کپڑوں میں تن کا یہ حال | مینا تو زمردین تھا اور مے لال
تھے راہ میں جمع شہر والے | یا مانگ بھری تھی موتیوں سے
چوٹی پہ شجر کے دام رکھا | چھپکا کہنے کو نام رکھا
گاشن سے نکل سکا نہ اس طرح | گونگے کے دہن سے بات جس طرح

اب نازک خیالی دیکھئے جو ایشائی شاعری کی جان ہے:-

حیرت سے تھے اہل ہوش ششدر | بت خانہ تھا بادشاہ کا گھر

لائی قسمت فسوں کے بس میں | فیروزہ تھا خاتم قفس میں

سائے سے بدن کے دھوپ پھیلی　　رخ صاف تھا آرسی تھی میلی

جو نخل تھا چپ کھڑا تھا ڈر سے　　سایہ غش میں پڑا تھا ڈر سے
اختر نے حجاب کی نظر سے　　در بند کیئے ہوا کے ڈر سے
منظور اسے خود بھی پردہ داری　　منھ پھیر کے آرسی اتاری
کہتی تھی حیا یہ ظلم ہے سخت　　آتی جاتی ہے سانس کمبخت
یہ نیل اور بدن کی زردی　　مینا سونے پہ لاجوردی

محاورات اور بول چال :—

تصویر کو دیکھے زر خریدا　　سودا لیا دردسر خریدا
کیا بخت ہے اور کیا مقدر　　بجلی تو کہیں۔ جلے کہیں گھر

تصویر کی کون ایسی ہستی　　اللہ تم اور بت پرستی

مٹی نہ کر آبرو کو جانی　　اندھا ہے کنواں جو ہو نہ پانی

چلتی آندھی کا ٹوکنا کیا　　بہتے پانی کا روکنا کیا

بیمار کو جان کھوتے کیا دیر　　نیند آہی گئی تو سوتے کیا دیر

وہ جل گئی۔ دو ڑی تاؤ کھا کر　　یہ ہنس پڑی بھاگی منھ چڑھا کر

بگڑی تو بنا یا دل لگی سے　　روٹھی تو منا لیا ہنسی سے

کچھ کھیل نہیں ہے عشق کی لاگ　　پانی نہ سمجھ یہ آگ ہے آگ
چار اپنے پرائے کیا کہیں گے　　تھو کیں گے برا بھلا کہیں گے
چپ مرغ تھے خوف سے غضب کے　　طوطے سے اڑے ہوئے تھے سب کے

کیسی ہے، خطا معاف، صورت　　دھویا کپڑا کہ صاف رنگت

چھائی تھی اداسی سی صحن پر　　جھاڑو سی پھری تمام گھر پر

"تم" لکھتی ہوں میں مگر نہ جانا　　منظور ہے لطف کا جتانا

بولی کہ نہ دوں گی یوں زباں میں　　کھیلی نہیں کچی گو لیاں میں

سوال جواب :-

پوچھا کہ "یہاں میں آیا کس طرح"　　بولی کہ قرار دل میں جس طرح"
پوچھا "یہ ستم کیا ہے کس نے ؟"　　بولی "تمھیں دل دیا ہے جس نے"
پوچھا "لشکر ؟" کہا کہ "ہاں تھا"　　پوچھا کہ "ملیگا ؟" کہا "نا"
بولا "یہ غضب !" تو بولی "خاموش"　　بولا کہ "پھر اب ؟" تو کھولی آغوش
بولا کہ "نہیں" تو بولی "بیکار"　　بولا کہ "رہائی ؟" بولی "دشوار"
بولا "کوئی پر غرور کیوں ہو ؟"　　بولی "کوئی ناصبور کیوں ہو ؟"

بولا وہ "کسی کا دل ہو بے چین" | بولی "تو وہ ضبط کرکے بے چین"
بولا "جو ضبط نہ کر سکے وہ" | بولی "تو مرے جو مر سکے وہ"
بولا "تو ہو خون یوں کسی کا" | بولی "تو ہوا کرے مجھے کیا؟"
بولا "یہ ستم ترس کے بدلے؟" | بولی "یہ کہو ہوس کے بدلے"
بولا کہ "ہوس ہی اور ہی چیز | یہ عشق ہے عشق۔ قدر کی چیز
اتنا کوئی شکل پر نہ اترائے | کس کی رہی اور کس کی رہ جائے"
بولی کہ "چلو چلو ہوا ہو | میں نے تو نہیں کہا کہ چاہو
تم لاکھ چھپاؤ کھا کے قسمیں | پوشیدہ غرض تھی اس ترس میں
کیا تم مرتے ہو سچ بتاؤ | کیونکر مرتے ہو مر تو جاؤ"

مصوری :—

ہونٹوں پہ تھی اُف جگر پہ تھا ہاتھ | تصویر پہ دل نگاہ کے ساتھ

صدمہ تھا۔ ملال تھا۔ قلق تھا | آنکھیں نیچی تھیں رنگ فق تھا

ہونٹوں پہ تھے دانت سر پہ تھی ہاتھ | سر سے جو ہٹے جگر پہ تھے ہاتھ

کانپا۔ سہما۔ ہٹا۔ ڈرا وہ | پھرنے کے لئے مڑا ذرا وہ

بولا یہ جھجک کے ایں! یہ کیا ہے؟ | بولی وہ تنک کے دل مرا ہے

سسکی لب پر شکن جبین پر — آنچل منھ پر نظر زمین پر
گردن نہ اُٹھا سکی وہ گلفام — احسان کا بوجھ شرم کا نام

(ہجر)

رنگت کہیں نام کو نہیں ہے — سادہ کاغذ ہے یا جبین ہے
کوٹھے پہ کھڑی ہے تو کھڑی ہے — کونے میں پڑی ہے تو پڑی ہے
چوٹی جو کھلی کھلے بلا سے — بال اڑتے ہیں تو اڑیں ہوا سے
تارے گن گن کے رات کاٹی — کوئی بولا تو بات کاٹی

اختصار کی کوشش :-

لعل و زر و سیم سب منگایا — بانٹا، بخشا، دیا، لٹایا

خسرو کو شبیہ و نامہ دینا — کہنا۔ سُننا۔ جواب لینا
آنکھیں جو کھلیں نصیب سویا — کانپا۔ سہما۔ غریب رویا

پوچھا جو مزاج کو کہا "خیر" — پوچھا سبب آنے کا کہا "سیر"

کھٹکی۔ جھجکی۔ زبان کھولی — بل ڈال کے تیوریوں پہ بولی

تسلیم جو کی۔ جواب پایا — غمدیدہ اٹھی۔ بلی۔ بٹھایا
پوچھا کہ لقب؟ کہا "پریشاں" — پوچھا کہ سبب؟ کہا کہ "طوفاں"
پوچھا مقصد؟ کہا کہ "پانا" — پوچھا مطلب؟ کہا "ملانا"

اپنے کے عوض کہی پرائی　　الٹی گنگا غرض بہائی

واقعہ نگاری:-

گردوں نے بلائے شب جو ٹالی　　چونکی طوطا پڑھانے والی
طوطا نہ ملا تو ہو گئی بھور　　سمجھی وہ کہ لے اڑا کوئی اور
طوطا بھی گیا قفس بھی ٹوٹا　　دل بھی دست ہوس بھی ٹوٹا
کالی آنکھیں لہو نے کیں لال　　انگارے ہوئے وہ پھول سے گال
چہرہ کندن سا تمتما یا　　الماس سے لعل کو دبایا
طائر کے مثال اڑ گیا رنگ　　جھنجھلائی کہ ہیں یہ کیا رنگ؟
او سرو چمن ادھر تو آتو　　طوطا مرا کیا ہوا بتا تو
او سوسن باغ تو بیاں کر　　او چاندنی راز تو عیاں کر
بتلا تو شمیم تو کہاں تھی　　سچ کہہ دے نسیم تو کہاں تھی
برگ گل لالہ تو ہی لب کھول　　کیا تو گونگی ہے او کلی بول
طوطا صیاد نے اڑا یا،　　چڑیاں ہیں چپ اڑن خدایا
کیا باغ میں سو رہا تھا سو یا　　کلیاں ناداں ہی تھیں گویا
انگور تو مے پرست ٹھہرے　　کیا اُن سے کہوں پیست ٹھہرے
آنے والی نسیم ہے بس　　جانے والی شمیم ہے بس
ہے لوٹ سے پاک انکا دامن　　پکڑے کوئی خاک انکا دامن

اقتباسات طویل ہوگئے اور مثنوی کے کل محاسن بیان نہ ہوسکے۔ آورد و تصنع کی مثالیں بکثرت ہیں۔ شاعر کہتا ہے:-

جتنی میرے سخن کی ہے دھوم　　سب ہے فیض اسیر مرحوم

اور رعایت لفظی کا گورکھ دھندا اس کشتِ سخن کی خاص پیداوار ہے۔ اس مثنوی سے بے لطف اشعار حذف کر کے مسلسل داستان بنائی جائے، تو بیشک۔

نکلے یہ زبان اہل فن سے ۔۔۔ لعل اُگلے ہیں شوق نے دہن سے

سیّد فرخ حسین فرخ نے ایک طویل مثنوی طلسم جہاں ۱۲۹۸ھ میں تمام کی۔ جن دپری۔ طلسم وجادو کے افسانوں سے نظم لبریز ہے۔

مجھے فکر فرخ یہ مدت سے تھی ۔۔۔ کروں نظم دلچسپ اک مثنوی
مگر رنج وغم میں رہا مبتلا ۔۔۔ نہ دی فکر نے مجھکو مہلت ذرا
زمانہ نے بدلا تھا کچھ ایسا رنگ ۔۔۔ کہ دل زندگانی سے تھا میرا تنگ
خدا نے کیا اپنا فضل وکرم ۔۔۔ ہوے دور دل سے مرے رنج وغم
ہوا شغل پھر مجھکو تصنیف کا ۔۔۔ کیا مینے نظم ایک قصہ نیا
طلسمات بھی اس میں ایسی لکھے ۔۔۔ کہ پر بندہ گئے طائرِ عقل کے
یہی مینے تاریخ اُس کی لکھی ۔۔۔ کہ بے مثل یہ لکھ گئی مثنوی

قصہ بحیثیت مجموعی دلچسپ نہیں۔ بعض الفاظ کی صحت مشتبہ ہے مثلاً۔

ہے اک ہم جلیس اُسکی دخترِ وزیر ۔۔۔ کہ وہ بھی ہے خود رشکِ بدرِ منیر

غرض آئی وہ ساحرۂ شکر شاد ۔۔۔ کیا شاہزادے کو پھر اس نے یاد

لیا دم نہ کافر نے پھر مطلقا ۔۔۔ سفر کو روانہ وہ چُپکا ہوا

کہاں سے یہ باتیں ہو جی لائیاں ۔۔۔ تمھاری تو ہین شامتیں آئیاں

مُلَبّب جو شربت سے بھا غر کیا | عجب عطر مینا سے باہر کیا

اسی زمانہ میں حافظ کریم بخش احقر کی مثنوی ترجمان عصمت شائع ہوئی۔

اس میں ہو لکھا بیانِ عصمت | تاریخ ہے "ترجمانِ عصمت" ۱۲۹۴ھ

سبب تالیف شاعر کی زبان سے سنئے :—

اک رات کہ چاندنی کھلی تھی | چلتی تھی ہوا بھی ٹھنڈی ٹھنڈی
اک صحنِ چمن ہرا بھرا تھا | بستر مرا وان لگا ہوا تھا
میں جس پہ بجان و دل فدا تھا | آغوش میں وہ ہی دلربا تھا
وہ مجھ سے خطاب کرکے بولا | یوں غنچہ دہن نے لب کو کھولا
اسوقت کہو کوئی کہانی | ہو خواہ نئی وہ یا پرانی
خاطر مجھے یار کی تھی منظور | میں آپ کو رکھ سکا نہ معذور
اک قصہ جو مجھکو یاد آیا | اُس راحتِ جان کو کہہ سنایا
سنکر اُسے خوش ہوا پریزاد | یوں مجھ سے کیا پھر اُس نے ارشاد
تم میری خوشی جو چاہتے ہو | تو اردو میں نظم اسکو کردو
لیکن رہے احتیاط اس کی | بڑھ جائے نہ کچھ بساط اسکی
اغلاق سے لفظ ہوں معرا | اردو کا ہو صاف روزمرہ
الفاظ بڑے نہ آنے پائیں | مشکل جو لغت ہوں وہ نہ آئیں
مضمون میں سلاست اسقدر ہو | آسانی سے ہم سمجھ لیں اسکو

قصہ دلچسپ ہے۔ زبان صاف اور سلیس شعریت بھی جگہ جگہ موجود ہے۔

پہلا سا رہا نہ اُس کا جوبن | سب اڑ گیا تھا رنگ و روغن
چہرہ تھا جو اُسکا ارغوانی | دو دن میں ہوا وہ زعفرانی

یکسر ہوئی زلفِ عنبر افشان ہم صورتِ سنبل پریشان
جو غیرتِ بدر تھا وہ ماتھا وہ مثلِ ہلال رہگیا تھا
یوں ہوگئے ابروانِ خمدار اتری ہوئی جس طرح ہو تلوار
بیمار بنی وہ چشم جادو جس طرح تھکا ہوا ہو آہو
رخسار جو وہ گلاب سے تھے کمہلا گئے پھول کی طرح سے
تھا حسن تمام پھیکا پھیکا باقی نہ رہا مزہ نمک کا
بالکل ہی بدل گئی تھی صورت اک رنج کی بن گئی تھی مورت
مسی سے نہ سرمہ سے سروکار تھی پان سے عطر سے وہ بیزار
تبدیل لباس کا تھا نہ ذکر کنگھی کی نہ چوٹی کی رہی فکر
دیکھا اُسے جس نے بیشتر تھا پہچان نہ سکتا تھا وہ اصلا

مثنوی استاد کی اصلاح سے محروم رہی اگرچہ مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی نے سرٹیفکٹ دیا ہے۔

بسکہ مملو ہے یہ فصاحت سے سال بھی نسخۂ فصاحت ہے

لیکن اغلاط و اسقام سے خالی نہیں اور اعلیٰ درجہ کی مثنویوں میں شمار نہیں کی جاسکتی۔
میر مہدی حسن احسن لکھنوی (نبیرہ حکیم نواب مرزا شوق) کی مثنوی جذبِ عشق اسی عہد کی تصنیف ہے ۱۳۰۱ھ میں مطبع حیدر آباد گزٹ سے شائع ہوئی مگر اب کمیاب ہے۔
صحت زبان اور جوش و خروش کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی مثنویوں میں شمار ہونے کے قابل ہے مگر بہارِ عشق کے سامنے رنگ نہ جم سکا اور قبولیت نصیب نہ ہوئی۔ قصہ بھی حکیم نواب مرزا کی مثنویوں سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔

جس جگہ پر غریب خانہ تھا وہیں اسکول اک زنانہ تھا

گویا گلشن تھا وہ حسینوں کا　　غنچہ رہتا تھا مہ جبینوں کا
اس مرقع میں تھیں جو تصویریں　　رکھتی تھیں نقش حُب کی تاثیریں
بوئے حسن و جمال پھیلی تھی　　ایک اک ان میں رشکِ لیلی تھی
شکل میں انتخاب ایک سے ایک　　حسن میں لاجواب ایک سے ایک

(کہاری کی گفتگو)

جب کہاری نے سُن لیا یہ پیام　　آئی ہنستی ہوئی وہ زیرِ بام
اپنے کوٹھے پہ دیکھکر مجھکو　　بولی چٹکی بجا کے وہ خوشخو
متوجہ کدھر ہیں یا حضرت　　اس طرف دیکھئے ذرا حضرت
پاس گھر کے کسی کا گھر بھی ہے　　آپ کو اُس کی کچھ خبر بھی ہے
آپ کوٹھے پہ لاتے ہیں تشریف　　پردہ داروں کو ہوتی ہے تکلیف
نہیں اچھا ہے بام پر آنا　　جب تلک ہو نہ جائے مردانہ

(معشوق کا سراپا)

ناک میں ہیرے کی وہ نازک کیل　　گورا گورا بدن چھریرا ڈیل
سر سے پا تک لباس ناز درست　　وہ کلائی تلک شلوکا چست
گُل رخسار میں گلاب کا رنگ　　طرزِ گفتار میں شباب کا رنگ
قد قیامت تو شورِ محشر چال　　گوری گردن میں ریشمی رومال
سادگی طبع کی صفائی میں تھی　　کالی بانکین فقط کلائی میں
دعویٰ ہونٹوں کو خوش بیانی کا　　ہر ادا میں مزہ جوانی کا
سحر آنکھوں میں قہر چتوں میں　　تازے پھولوں کے ہار گردن میں
بندے ہیرے کے دونو کانوں میں　　چٹا چٹا گھٹنا رانوں میں

جسم میں سب شباب کا جوبن — چہرے پر کمسنی کا بھولا پن

(وصل)

تلملا کر وہ کروٹیں لینا — کبھی مجبور ہو کے رو دینا

گہہ سمٹ کر بدن چرا لینا — کبھی شرما کے منہ چھپا لینا

حکیم جعفر علی بیمار نے "گلشن جانفزا" کا مشہور قصہ نظم کیا۔ "ہے شراب دو آتشہ واللہ" ۱۳۰۶ھ مصرعہ تاریخ ہے۔ داستان دلچسپ زبان صاف اور شستہ ہے۔ مثنوی کا نام "زر جعفری" ہے

ہر اک شکل میں غیرت حور تھی — ز سر تا بپا نور ہی نور تھی

نشہ میں کچھ ایسی وہ بدمست تھیں — کہ پڑتا تھا پاؤں کہیں کا کہیں

بسی عطر میں انکی پوشاک تھی — جبیں پر تھی ہر اک کے افشاں چنی

پھنسی آستینوں کی تھیں کرتیاں — بدن میں چھلاوے کی سی پھرتیاں

جوانی کی دل میں بھری تھی امنگ — پسند اُن کو آتی تھی پوشاک تنگ

غضب کا تھا آنکھوں میں سرمہ لگا — لبوں پر تھا بیڑا ہر اک کا جما

یہ تھا انکے گالوں کی سرخی کا حال — کہ دی جیسے مل کوئی منھ پر گلال

گلے میں پڑے تھے جو پھولوں کے ہار — دکھاتے تھے وہ اور ہی کچھ بہار

بعض جگہ بندش سست اور مذموم تعقید بھی ہے۔ تاہم مثنویوں کے صف اول میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔ منشی انوار احمد تسلیم سہسوانی کی مثنوی سعدین اور مرزا عباس حسین ہوش لکھنوی کی دفتر سحر اسی دور کی تصنیفات ہیں۔ سعدین کی تالیف میں شرط تھی "ہر محل کے ہو رنڈیوں کی زبان بر محل ہو اسی طرح کا بیان" ساری مثنوی ضلع جگت سے بھری ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۸۷ھ ہے۔

بہر تاریخ اور بہر شمار — لکھو تسلیم نادرست اشعار

شادی کی چند رسمیں دیکھئے:-

رقص سے ہو رہی تھی محفل گرم | تھاپ طبلے کی خیر باد شرم
لطف انگیز ٹوٹکے ٹونے | ہنسی اور ٹھٹھے میں لگے ہونے
اک پرستار چلبلی اچپل | لائی جوتی پہ پار کر کاجل
کان سے اک لگا گئی چونا | چھیڑتی ایک ایک سے دونا
ہو چکیں ریت رسمیں جب بالکل | ڈومنوں نے گائی تب بابل

دفتر سحر متانت و تہذیب میں بالاتر ہے۔ زبان شستہ اور فصیح۔ انداز بیان دلچسپ ہے۔

حال اپنا سا اور کا بھی جانو | لگ جاؤ گلے سے کہنا مانو
کیسا تھا یہ عشق منھ سے بولو | اب چپ نہ رہو زبان کھولو
الٹی کرتی ہوں میں سماجت | آخر کب تک کروں لجاجت
کچھ بات یہ کام کی نہیں ہے | صورت کوئی نام کی نہیں ہی
ایسا نہ ہو لوگ نام رکھیں | اس عشق کا روگ نام رکھیں
پھر بولی یہ ٹھنڈی سانس بھر کے | آنسو ٹپکا کے آہ کر کے
ہے ہے مجھے کیا یہ ہو گیا ہی | دیوانی سڑن ہوں کیا بلا ہی
یہ تو تصویر جان جان ہی | ای دل وہ مگر یہاں کہاں ہی
یہ کہکے اٹھا جو دل میں اک درد | بیٹھے بیٹھے ہوا بدن سرد
طاقت نے کہا سلام میرا | اب یاں نہیں کوئی کام میرا
پھر زور جو ضعف نے دکھایا | تیورا کے گری وہ چکر آیا
سنبھلی کچھ کچھ سنبھالنے سے | پر عشق ٹلا نہ ٹالنے سے
ہر سمت ہوا جو ہو کا عالم | خوف آنے لگا مکان سے بیم

جھونکے کھاتی ہوئی ہوا سے　　گلشن میں گئی محل سرا سے

ترانۂ شوق کے بعد لکھنؤ اسکول کے طرز میں ایک مثنوی اور لکھی گئی مگر افسوس کہ وہ نا تمام رہی۔ سید ولایت علی فردوس نے فسانہ عجائب کا قصہ نظم کرنا شروع کیا تھا۔ اگر وہ اتمام کو پہونچتا اور شاعر کو نظر ثانی کا وقت ملتا تو ادب اردو میں ایک گران قدر اضافہ ہوتا۔ انداز بیان دکھانے کو چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

(۱) ماہ طلعت نے طوطے سے پوچھا کہ اُس کی سی خوبصورت شکل "گزری ہو کہیں تری نظر سے"

طوطے کی ذات بے مروت　　بولا بگڑی بنا کے صورت

خوبی کیا اپنی پوچھتی ہو　　جیسا کہتی ہو ایسی ہی ہو

یہ جواب سنکر ماہ طلعت بہت چڑھی۔ طوطے کو گالیاں دے رہی تھی کہ شہزادہ محل میں آگیا۔ دیکھا کہ بیگم طوطے سے لڑ رہی ہے۔ اُسوقت کی تصویر ہے:۔

سرگرم جلال ہو رہی تھی　　فیروزے پہ لال ہو رہی تھی

(۲) ملکۂ مہر نگار شہزادۂ مہمان کو اپنے پاس روکنا چاہتی ہے اور بہت گفتگو کے بعد اپنا حالِ زار بیان کرتی ہے:۔

ہنسنا تو گیا خوشی کے ہمراہ　　رونا ہے بس اب یہی کہ ہر گاہ

یونہیں اگر اشکِ غم بہینگے　　دیکھیں گے جو لوگ کیا کہینگے

ہنس ہنس کے مجھے رلائیں گی اور　　بگڑوں گی جو میں بنائیں گے اور

کب تک نہ یہ حال ماں سنیں گی　　پائیں گی خبر تو سر دھنیں گی

جب ہو گی اُنھیں حضوریٔ شاہ　　مانند قرآن زہرہ و ماہ

خلوت میں کھینگی راز میرا　　پردے میں کھلیگا ساز میرا

جب سامنے انکے جاؤنگی میں | آئیگی حیا لجاؤں گی میں
لیکن تجھے کیا مری حیا سے | رُسوا ہو کوئی تری بلا سے
قربان وفائے قیس مفتوں | اپنی لیلیٰ کا تھا جو مجنوں
گو اس کی دلہن بنی خدیجہ | پر وصل کا ہجر تھا نتیجہ
اک جا ہوئے عروس و داماد | شادی نے کیا نہ غم سے آزاد

شہزادہ کہتا ہے کہ قیس کا جس رات کو عقد ہوا تھا ستاروں کی نظر بد تھی "عقرب میں قمر تھا قوس میں تیر" اسوجہ سے زوجین میں موافقت نہیں ہوئی بلکہ بگڑ کر بولتی ہے۔

سعدین کا عقد جب ہوا تھا | اور زائچہ ڈال طلب ہوا تھا
گوئندۂ فرخی و شومی | سمجھی میں منحس تھے وہ نجومی!!

شاعر کی لاابالی طبیعت یا زمانہ کی ناقدری سے مثنوی ناتمام رہی مگر اسی عہد میں مغربی تعلیم اور فرنگی تہذیب کے اثر سے چمنستان ادب کا رنگ بھی یکایک بدل گیا۔ اسلوب بیان کے "داخلی" اور "خارجی" پہلو دیکھے جانے لگے "نفسیات" و "جمالیات" کی دھوم مچی۔ شعر کا موضوع بجائے تفریح طبع و تحریک جذبات کے فلسفہ و اخلاق کی تعلیم سمجھا گیا۔ نازک خیالی۔ معنی آفرینی۔ سخن طرازی۔ بلند پروازی کا لغویات و ہزلیات میں شمار ہوا۔ پہلے خیال آفریں اور خلاق معانی ہونا شاعر کا کمال تھا۔ کیفیات اور تاثرات اشارات و کنایات میں ادا کرنا شعر کا حسن تھا۔ تسلسل بیان مصوری وحدت کردار اور واقعہ نگاری مثنوی کی خصوصیت تھی۔ اب ادا شناسان فرنگ نے فتویٰ دیا کہ مثنوی کے لئے سادگی لازمی ہے۔ اور وہ تشبیہات۔ تمثیلات اور استعارات کا بار نہیں سنبھال سکتی۔ یہ بالکل بجا اور درست ہے! اسی بوجھ سے یوسف زلیخا جامی دب گئی۔ سکندرنامہ نظامی کی صناعی مٹی میں ملی۔ نلدمن فیضی اور سب سے بڑھکر مثنوی غنیمت بے نشان ہوگئی

گلزار نسیم اور طلسم الفت خس و خاشاک کے انبار رہیں ہیں۔ صرف میر اثر کی "خواب و خیال" تاریخ تصنیف سے اس وقت تک ہر لحظہ اور ہر ساعت عاشق مزاجوں کی گلے میں حمائل رہی اور یہ خوبصورت شعر زبان زد خلائق ہے :-

وانت جب مجھکو یاد آتے ہیں — دل کلیجا سبھی چباتے ہیں!!!

اس طرز جدید میں شمس العلما محمد حسین آزاد۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ مولانا شبلی۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ مرزا محمد ہادی رسوا۔ سرور جہان آبادی وغیرہم نے چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں۔ پنجاب کے ایک شاعر نے کلام مجید کا ترجمہ نظم کیا۔ دوسرے بزرگ نے شاہنامۂ اسلام کی ترتیب شروع کی مگر ان نیچرل نظموں پر رائے زنی کا ابھی وقت نہیں ہے۔ آج سے پچاس ساٹھ سال کے بعد جو سخن کا کھرا کھوٹا پرکھنے والے ہوں گے وہ ان پر صحیح اور بے لوث تنقید کریں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ اردو کی قدیم مثنویوں میں حیات جاوید صرف سحر البیان۔ گلزار نسیم۔ اور زہر عشق کو نصیب ہوئی۔ لیکن میر تقی کی دریائے عشق۔ نواب محبت خان کی اسرار محبت۔ ہوس کی لیلی مجنون۔ حقیقت کی "ہشت گلزار" مومن کی قول غمیں۔ قلق کی طلسم الفت۔ شوق کی بہار عشق۔ محسن کاکوروی کی صبح تجلی۔ منیر کی معراج المضامین۔ تسلیم کی شام غریبان۔ شوق قدوائی کی ترانۂ شوق۔ ہوش کی دفتر سحر مثنویوں کی صف اول میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔ آئندہ نسل کے مغرب زدہ تبصرہ نگار بتائیں گے کہ طرز جدید کے "خوہند و خوشند و بوند ارند" ولایتی پودھوں میں کوئی قطرہ آب حیات کا تھا یا نہیں۔

کیا کہوں تجھ سے میں اثر کہ اسے — کس طرح دیکھتا ہوں خواب کے بیچ

ادب اردو نے تین سو برس کی قلیل مدت میں اس قدر کثیر ذخیرہ مثنویوں کا فراہم کیا کہ آج انکی مکمل فہرست بھی بنائی نہیں جا سکتی۔ سیکڑوں مثنویاں تلف ہوگئیں۔ پچاسوں مثنویوں کا نام صرف

شعرا کے تذکروں میں درج ہے اور ان کا نشان نہین ملتا - بیسیوں مثنویاں بازار میں موجود ہیں - لیکن زبان وبیان کی حیثیت سے سخن سرایوں کی مجلس میں پیش کرنے کے لائق نہیں - بعض اعلیٰ درجہ کی مثنویاں کتب خانوں میں محفوظ ہیں - مگر عوام کی وہاں تک رسائی نہیں ان سب سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی مثنویوں کی اتنی بڑی تعداد اردو میں موجود ہے کہ تعداد اشعار اور مدت عمر کے اعتبار سے نظم اردو کی یہ گراں بہا صنف فارسی کی ہم پلہ گمان کی جاسکتی ہے -

اس مضمون میں اُن ملند پایہ مثنویوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو راقم سطور کے مطالعہ سے گزریں یا جنکے نمونے مستند تذکروں میں درج پائے گئے اور وہ مثنویاں شامل نہیں کی گئیں جو صرف مذہبی حیثیت رکھتی ہیں - اور ادب کی چاشنی سے محروم ہیں - بعض گرانقدر مثنویاں اس وجہ سے مذکور نہ ہوسکیں کہ اُن کے صحیح نام بھی جامع الاوراق کو معلوم نہ تھے تاہم ایک سو سے زائد قدیم نظموں پر تبصرہ کیا گیا ہے -

مثنوی	نام شاعر	سنہ تصنیف	کیفیت
(پہلا دور دکن کی شاعری)			
تحفۂ عاشقان	وجدی	سنہ ۱۰۱۵	
مثنویات قطب شاہ	سلطان محمد قلی قطب شاہ	سنہ ۱۰۱۸	
سیف الملوک و بدیع الجمال	غواصی	سنہ ۱۰۳۵	نمونہ درج ہے
طوطی نامہ	״	سنہ ۱۰۴۹	
علی نامہ	نصرتی	سنہ ۱۰۶۳	نمونہ درج ہے
پھول بن	نشاطی	سنہ ۱۰۶۶	
ماہ پیکر	جنیدی	×	

مثنوی	نام شاعر	سنہ تصنیف	کیفیت
بکٹ کہانی	محمد افضل مشرقی	+	نمونہ درج ہے
تعریف شہزادہ	افضل الدین خان فضلی	+	" " "
یوسف زلیخا	ملا ہاشمی	+	" " "
من لگن	خواجہ بحری	سنہ ۱۱۱۲	نمونہ درج ہے
	دوسرا دور ولی سے ۱۱۹۷ھ تک		
دہ مجلس منظوم	میر شمس الدین ولی	سنہ ۱۱۴۱	نمونہ درج ہے
تعریف سورت	"	+	"
بوستان خیال	سید سراج الدین اورنگ آبادی	سنہ ۱۱۶۰	تبصرہ مع انتخاب
عشق شیشہ گر	مرزا رفیع سودا	+	اقتباس شامل ہے
شعلہ عشق دریائے عشق بیان دنیا	میر تقی میر	+	تبصرہ معہ انتخابات
خواب وخیال	میر اثر	+	تبصرہ معہ انتخاب
ہجو سرما	قیام الدین قائم	+	" " "
ساقی نامہ	محمد فقیہہ دردمند	+	" " "
داستان عشق حقہ	جعفر علی خان دہلوی متخلص بہ زکی	+	نمونہ درج ہے۔ میر تقی علیہ الرحمۃ "نکات الشعرا" میں لکھتے ہیں کہ "مثنوی حقہ" کے صرف دو تین اشعار زکی نے کہے تھے شیخ حاتم نے نظم تمام کی۔ "و آں مثنوی خالی از مزہ نیست"۔ اسی مثنوی کا شعر ہے: برہ کی راہ کے گوہر بھبھولی ٭ کہ کانٹے باٹ میں جاتی ہیں توڑے
لیلی مجنوں	میر سعادت علی سعادت	+	
بخشی طوائف برسات کی ہجو	شیخ قلندر بخش جرأت	+	

مثنوی	نام شاعر	سنہ تصنیف	کیفیت
اسرار محبت	نواب محبت خان	سنہ ۱۱۹۷	تبصرہ مع اقتباس
لاٹھی نامہ	حافظ فضل علی ممتاز	+	" " "
دیمک نامہ	گدا علی بیگ بسمل	+	" " "
	تیسرا دور میر حسن سے سنہ ۱۲۵۳ تک		
سحر البیان	میر حسن	سنہ ۱۱۹۹	مفصل ریویو ہے
مثنویات انشا	سید انشا	+	تبصرہ مع انتخابات
مثنوی ریختی	سعادت یار خان رنگین	+	" " "
بحر المحبت	شیخ غلام ہمدانی مصحفی	+	" " "
سوز و ساز	طالب علی خان عیشی	+	" " "
لیلے مجنون	میر تقی ہوس	+	" " "
سبعہ سیارہ	نواب عظیم الدولہ سرور دہلوی	+	نمونہ درج ہے
مثنوی ناتمام لیلے مجنوں	شاہ محمد عظیم المعروف بہ شاہ جھولن	+	" " "
پدماوت	عبرت و عشرت	سنہ ۱۲۱۱	تبصرہ مع اقتباسات
بہار دانش	مرزا جان طپش	+	" " "
ناز و نیاز	شیخ غلام علی راسخ	+	" " "
نور الانظار	" " "	+	" " "
یوسف زلیخا	عاشق یا فگار	سنہ ۱۲۱۲	" " "
ہفت پیکر	حیدری	+	

مثنوی	نام شاعر	سنہ تصنیف	کیفیت
عاشق صنم	شاہ تراب علی کاکوروی	۱۲۱۸ھ	تبصرہ مع اقتباسات
مثنویات قاسم	حکیم قدرت اللہ خان قاسم	×	
شاہنامہ	لالہ مولچند منشی	۱۲۲۵ھ	تبصرہ مع انتخاب
ہشت گلزار	شاہ حسین حقیقت	۱۲۲۵ھ	″ ″ ″
مثنویات مومن	حکیم مومن خان دہلوی	۱۲۳۱ھ	″ ″ ″
نلدمن	بھگونت سہائے راحت	۱۲۴۴ھ	″ ″ ″
زہرہ بہرام	کاکوروی	۱۲۴۷ھ	″ ″ ″
چشمۂ شیرین	مسکین خیرآبادی	۱۲۴۵ھ	نمونہ درج ہے
گلزار ابراہیم	مولوی ابوالحسن حسن	۱۲۵۱ھ	تبصرہ مع انتخاب
نلدمن	نکہت دہلوی	۱۲۵۵ھ	″ ″ ″
مثنوی عشقیہ	شیخ عبدالرؤف شعور	۱۲۵۳ھ	″ ″ ″
	چوتھا دور ۱۲۵۴ھ سے غدر تک		
نظم سراج / معراج المضامین	ناسخ لکھنوی	۱۲۵۴ھ	تبصرہ مع اقتباس
گلزار نسیم	پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی	۱۲۵۴ھ	مفصل ریویو ہے (حاشیہ پر "خیابان ریحان" کا تذکرہ ہے۔)
سراپا سوز	قاضی صادق علی خان	+	تبصرہ مع اقتباس
صیدیہ	میر وزیر صبا	۱۲۶۴ھ	″ ″ ″
تعریف امین آباد	میاں دلگیر لکھنوی	×	نمونہ درج ہے
رامائن	جگن ناتھ خوشتر	۱۲۶۸ھ	″ ″ ″

مثنوی	نام شاعر	سنہ تصنیف	کیفیت
بھاگوت	جگناتھ خوشتر	×	نمونہ درج ہے
بہارستانِ شادی	لالہ حسین بخش واقف	سنہ ۱۲۶۷	〃 〃 〃
مہر و ماہ	نواب علی بہادر والی باندہ	سنہ ۱۲۶۷	〃 〃 〃
جلسۂ رہس	ہادی علی خان بیخود	سنہ ۱۲۶۹	تبصرہ مع اقتباس
شیرین خسرو	گوبند پرشاد فضا لکھنوی	×	〃 〃 〃
دریائے تعشق افسانۂ عشق بحر الفت	واجد علی شاہ اختر		〃 〃 〃
درۃ التاج	مظفر علی خان اسیر لکھنوی	سنہ ۱۲۷۰	〃 〃 〃
لذتِ عشق	آغا حسن نظم لکھنوی	×	〃 〃 〃
مثنوی عالم	نواب بادشاہ محل صاحبۂ عالم	×	〃 〃 〃
طلسم الفت	آفتاب الدولہ قلق		مفصل ریویو ہے
فریب عشق بہار عشق زہر عشق	حکیم نواب مرزا شوق لکھنوی	×	〃 〃 〃
سحر عشق	حکیم آغا حسن ازل لکھنوی	×	
قضا و قدر	سید غلام حسین قدر بلگرامی	سنہ ۱۲۷۴	تبصرہ مع اقتباس
	پانچواں دور غدر کے بعد ۴۰ سال تک		
حزنِ اختر	واجد علی شاہ اختر	×	نمونہ درج ہے

مثنوی	نام شاعر	سنہ تصنیف	کیفیت
شعاع مہر	مرزا حاتم علی مہر	۱۲۷۵ھ	تبصرہ مع اقتباس
مثنوی عشقیہ	عبداللہ خان مہر	×	" " "
گلزار رحیم	حافظ رحیم الدین کاکوروی	×	
نور تجلی	منشی امیر احمد امیر مینائی	×	
ابر کرم	"	×	
فریاد داغ	نواب مرزا خان داغ دہلوی	×	نمونہ درج ہے
صبح تجلی	حضرت محسن کاکوروی	×	تبصرہ مع اقتباس
چراغ کعبہ	"	×	" " "
شفاعت و نجات	"	×	" " "
حجاب زنان	سید اسمٰعیل حسین منیر لکھنوی	×	" " "
معراج المضامین	"	×	" " "
نالۂ تسلیم	امیر اللہ تسلیم لکھنوی	×	" " "
شام غریبان	"	×	" " "
صبح خندان	"	×	" " "
دل و جان	"	×	" " "
ترانۂ شوق	احمد علی شوق قدوائی	۱۳۰۵ھ	مفصل ریویو ہے
طلسم جہان	سید فرخ حسین فرخ	۱۲۹۸ھ	تبصرہ مع اقتباس
ترجمان عصمت	حافظ کریم بخش احقر	۱۲۹۴ھ	" " "
زر جعفری	حکیم جعفر علی خان بیدار	۱۳۰۶ھ	" " "

مثنوی	نام شاعر	سنہ تصنیف	کیفیت
جذب عشق	میر مہدی حسن احسن لکھنوی	۱۳۰۸ھ	تبصرہ مع اقتباس
سعدین	منشی انوار احمد تسلیم سہسوانی	۱۲۸۷ھ	" " "
دفتر سحر	مرزا عباس حسین ہوش لکھنوی	×	" " "
باغِ فردوس	سید ولایت علی فردوس	×	" " "

ادیب سحر طراز جناب منشی محمد امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے

کی

تصانیف کی فہرست

ملنے کا پتہ

محمد ذکی احمد علوی آنریری لائبریرین امیر محل لائبریری

نصیر باغ کاکوری

لکھنؤ

یوسفی برقی پریس لکھنؤ میں چھپی

DUE DATE